بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

صدائے صوت مکۂ مکرمہ

شانِ ایزدی! مذہب تو مختلف افرادِ انسانی میں ایک واسطۂ مشترکہ ہو کر
محبت واتحاد پیدا کرنے آیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہی نسلِ انسانی میں باعثِ نفاق و
شقاق ہو گیا۔ انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے۔ اُس کا تمدن اُس کی تہذیب
باہمی اتفاق واتحاد پر مبنی ہے۔ قومی مشارکت یا لسانی مجانست اتفاق واتحاد کی
وہ طاقت ہرگز اپنے اندر نہیں رکھتی جو اشتراکِ ملیہ میں موجود ہوتی ہے ✦

اگر مذہب خدا کی طرف سے تھا، تو ضرور تھا کہ ہر ایک قوم کو ایک ہی شکل میں
دیا جاتا، اور کوئی قوم اُس کی برکت سے خالی نہ رہتی، خصوصاً اُن ایام میں جب

مختلف انسانی طبقوں میں میل جول کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ رب العالمین نے جسمانی پرورش کے لئے نہ تو کسی خاص قوم کی طرفداری کی، نہ کسی سے بخل کیا، جو کچھ ایک قوم کو دیا وہی دنیا کی سب قوموں کو دیا۔ ایسے خداوند کی ربوبیت تامہ اس بات کی ہی مقتضی تھی کہ اُس کی طرف سے وہ مبارک چیز جس کا نام مذہب ہے ہر ایک انسان کے حصّہ میں یکساں آئے۔ بات تو یہ صاف تھی لیکن دنیا کی مشہور الہامی کتابوں میں سے اگر کسی کتاب نے اس صداقت کو تعلیم کیا تو وہ قرآن کریم ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اخوت و اتفاق پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کیا تعلیم ہوسکتی تھی۔ کہ دنیا میں ہر قوم کی طرف خدا کے نبی آئے، دنیا کے سب مذاہب اپنی اصلی ہیئت و صورت میں ایک ہی سرچشمہ سے نکلے۔ اور ایک ہی تعلیم لائے؟ جب اللہ تعالیٰ نے ایک ہی چیز سے نسل انسانی کی جسمانی پرورش کی، تو یہ بھی ضروری تھا کہ روحانی پرورش بھی ایک ہی طریق سے، ایک ہی چیز سے ہو۔ قرآنی تعلیم نے اس معاملے میں دل مسلم کو ایسا وسیع کر دیا ہے، کہ وہ کسی کے مذہب کو اُس کی ابتدائی حالت میں انسان کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے ربّ واحد کی طرف سے سمجھ کر اپنے آپ کو اُس کا مطیع قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح انسانی فسادات کی پہلی بنیاد کا قلع قمع کر دیتا ہے، ہم سب ایک ہی

منبع سے نکلے ہیں، اور ایک ہی سرچشمہ سے ہمیں زندگی کا پانی پلایا گیا ہے لیکن انسانوں نے اس مصفا اور پاکیزہ پانی کو جو وحی آلہی کی شکل میں خدا کی طرف سے سب کے لئے یکساں نازل ہوا مختلف آمیزشوں سے گدلا کر دیا۔ جو انسانوں میں فساد اور اختلاف کا باعث ہو گیا۔ اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اگر خدا سب کا ہے، اور وہ بالضرور سب کا ہے، تو یہ حقیقت بدیہی ہے کہ سب کی طرف خدا کا ایک ہی مذہب آنا چاہیئے چنانچہ اسی صداقت کی طرف قرآن کریم ذیل کے الفاظ میں اشارہ فرماتا ہے:۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"ہمیں اپنی اُلوہیت کی قسم ہم نے تو تجھ (نبی صلعم) سے پہلے ہر قوم کی طرف رسول بھیج دیا لیکن شیطان نے لوگوں کے اعمال کو (جو منشاء آلہیہ کے مطابق نہ تھے) اُن کی نگاہ میں خوبصورت کر دکھایا۔ آج وہی اُن کا ولی ہے اور یہی باتیں اُن کے لئے موجب عذاب ہو گئیں۔ انسانوں میں طرح طرح کے اختلاف پیدا ہو گئے اسی لئے ہم نے یہ کتاب (قرآن شریف) تمہاری طرف بھیجی ہے کہ کھلے کھلے دلائل کے

ساتھ ان اختلافات کو مٹا دیا جاوے" اور سب کو اصلی مذہب پر جو قدیم سے ایک ہی تھا اور ایک ہی صورت میں خدا کی طرف سے ہر جگہ آیا جمع کر دیا جائے *

یہ کس قدر سچی صداقت ہے کسی قوم یا کسی انسان کو خدا تعالیٰ پر کیا حق حاصل ہے کہ وہ تو خدا سے راستہ پائے اور دوسرے اُس سے محروم رہیں اور اگر وہی حقیقی راہ فلاح و نجات کی ہے تو سب کے لئے ایک ہی ہونی چاہئے اور قرآن مجید کہتا ہے کہ سب کے لئے ایک ہی ہے لیکن آج یہ مختلفہ مذاہب میں جو اختلاف عظیم ہے اس کا باعث انسان کے سوا اور کون ہے؟

یہ امر بھی ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک وقت انسان کو صحیح رستہ بتائے لیکن جب انسان اپنی غلط کاری سے وہ راستہ کھو بیٹھے، یا اُس کی شکل و صورت بدل دے۔ تو وہ ہادی حقیقی خاموش رہے۔ اور انسان کو غلطی پر قایم رہنے دے اسی طرح یہ امر بھی اُس کی شان توحید سے دور نظر آتا ہے۔ کہ وہ پہلے تو ایک راہ ہدایت تجویز کرے۔ پھر ہزاروں برس کے تجربہ کے بعد وہ راہ جب اُسے مفید نظر نہ آئے تو اُس کی جگہ ایک اور راہ تجویز کرے جیسا کہ کلیسا کی تعلیم ہے یہ تو اُس کے علم ازلی پر ایک بدنما دھبّہ ہے *

ان منطقی قضایا کا جن میں در اصل میں سے کل مذاہب دیگر پر ایک مختصر سا

تبصرہ کر دیا ہے۔ لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اگر شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر و نیاء
مذہب میں اس قدر اختلاف عظیم تھا کہ ایک مذہب دوسرے مذہب سے بالکل
برعکس تھا۔ تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ خاتم النبیین کے ذریعے از سر نو مذہب حقہ
کو اپنی اصلی حیثیت و شکل میں تعلیم کرے۔ چنانچہ اس برگزیدہ انسانؐ نے سرچشمہ ہدایت
سے اُسی مذہب کو پایا جو اُس سے پہلے نوحؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک ہر قوم
و ملّت کو دیا گیا اُس نے سب سے پہلے ان قوموں کو مذہب کی طرف دعوت دی
جنہیں ایک نہ ایک وقت خدا کی طرف سے کوئی کتاب پہنچ چکی تھی لیکن وہ اس
وقت ایک طرف تو کتاب اللہ کو محرف کر چکے تھے دوسری طرف حقیقی راستے
سے دور چلے گئے تھے اس لئے اُس نے الفاظ ذیل میں کل اہل کتاب کو حقیقی
راہ کی طرف بلایا۔ فرمایا:-

قُلْ يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

کہو اے خدا کی کتاب والو ہم کیوں ایک دوسرے سے جھگڑے اور تنازعہ
کریں، کیوں نہ ایک ایسی بات پہ جمع ہو جائیں جو ہم سب میں مشترک اور متحد
ہے ہم خدا کے سوا کسی کی فرمانبرداری نہ کریں اُس کے ساتھ کوئی شریک

ہی نہ ٹھہرائیں اور اس کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائیں +

اللہ اللہ کس قدر سیدھی صاف اور بے نفسانہ تعلیم ہے اور غور کرو تو کل فلسفہ زندگی کا نچوڑ ہے۔ آنحضرت صلعم یہ تو نہیں کہتے کہ جو میں کہتا ہوں سنو یا میرا تجویز کردہ مذہب قبول کرو خدا کی فرمانبرداری کی تعلیم دیتے ہیں کیا علوم جدید ہماری معاشرت اور ہمارے تمدن نے اس مذہب کی تصدیق نہیں کی اسی مذہب کا نام **اسلام** ہے یعنی خدا تعالےٰ کے قوانین پر چلنا جسمانیات میں سائنس نے ہمیں اُن قوانین کا پتہ دیا جو خدا تعالیٰ نے نظام عالم کے چلانے کے لئے بنائے ہم مجبوراً اُن قوانین پر چلتے ہیں ان قوانین پر چلنے کا نام **اسلام** ہے۔ اس موضوع پر میں آگے چلکر کچھ لکھوں گا خلاصتہً یہاں اسی قدر کہتا ہوں کہ کائنات کی ہر ایک چیز اور اُس میں انسان بھی شامل ہے۔ اپنے نشو ونما پانے کے لئے اور اپنے جوہر مضمرہ کو کمال تک پہنچانے کے لئے مقررہ اور لاتبدیل قوانین کی اطاعت پر مجبور ہے۔ سائنس نے اپنی ہر شاخ میں اسی امر پر مہر صداقت ثبت کی ہے ہر شعبۂ زندگی میں انسان کا یہی مذہب ہے جسمانیات میں یا ذہنیات میں اگر ان قوانین کو انسانی مشاہدے اور تجربے نے دریافت کر لیا ہے تو اخلاقیات اور روحانیات میں الہام آلہی نے قوانین آلہیہ کیطرف انسانکی رہنمونی کی ان قوانین پر

چلنے کا نام خواہ جسمانیات میں ہو یا روحانیات میں عربی زبان نے اسلام تجویز کیا ہے۔ کیا ہم اس طریق سے انحراف کر سکتے ہیں۔ ہمارا ان معنوں میں اسلام سے منحرف ہونا تباہی اور ہلاکت کو خریدنا ہے اس حقیقت کو کیسے سیدھے اور صاف الفاظ میں قرآن مجید نے چند آیات کے ذریعے بیان کر دیا ؎

"أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ" ۝ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ ۝ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝

خدا کی راہ (قوانین آلہیہ) کو چھوڑ کے یہ کس دین کی تلاش میں ہیں دیکھتے نہیں کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ طوعًا و کرہًا اُس کے قوانین کی اطاعت کر رہے ہیں خدا کا دین تو اسلام (اطاعت قوانین آلہیہ) ہے پھر جو چاہے اسلام (اطاعت قوانین آلہیہ) کو چھوڑ کے دیکھ لے اُس کا یہ فعل مقبول نہ ہو گا وہ نقصان اُٹھائے گا ؎

کوئی ہے جو اس صداقت سے عملًا انکار کرے اور آن واحد میں اُس کی زندگی کا خاتمہ نہ ہو۔ یہی مذہب یہی بات خدا کے کل نبیوں نے تلقین کی۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی یہی حقیقت ہے اہل کتاب کو اسی حقیقت کی طرف بلایا گیا ہے ؎

تیرہ سو برس ہوئے جب یہ آواز **وادیٔ فاران** سے آئی ہں صلائے عامہ کے جواب میں لکھوکھا نہیں کروڑوں اہل کتاب نے لبیک کہا وہ داخل اسلام ہوئے۔ اس طرح اسلام نے آہستہ آہستہ ایک عالمگیر اخوت پیدا کر کے ایک بڑے حصہ دنیا کو فساد و نزاع سے بچا لیا۔ مشرق میں بہت جلد یہ سیدھا سادہ اور مختلف پیچیدگیوں سے پاک مذہب قایم ہو گیا لیکن مغرب تک یہ باتیں نہ پہنچ سکیں۔ آج مغرب و مشرق کا باہمی تباعد اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس سے دنیا کے امن میں سخت خلل واقعہ ہو رہا ہے۔ اس نفاق و شقاق کا موجب بہت سے سیاسی امور بتائے جاتے ہیں لیکن واقعات حاضرہ نے اس امر کو ثابت کر دیا ہے کہ در اصل ان سب کی تہ میں مذہبی اختلاف ہے اگر ملّی تنازعات ختم ہو جائیں تو باقی وجوہ اختلاف کا کسی صحیح مفاہمہ کے ذریعے فیصلہ پا لینا کوئی امر مشکل نہیں آئرلینڈ کے فساد اس کی بہترین مثال ہیں۔ اختلاف مذہب نے ہی اس ملک کو تباہ کر رکھا ہے۔ دوسری طرف بلگیریا۔ سرویہ۔ مانٹینگرو۔ یونان۔ آج کل کے نئے پیدا شدہ زیقوسلاف۔ یہ سب کے سب مختلف قومیں ہیں تمدن۔ اخلاق۔ تہذیب میں ایک دوسرے سے جدا ہیں امور تہذیب و تمدن میں اُن میں سے بعض کا درجہ نہایت ہی ادنیٰ ہے۔ بالمقابل ترکوں کی تہذیب اُن کی انسانیت اُن کی

شرافت اخلاق کو آج سے بیسیوں سال پہلے یورپ کے بہترین عمائد نے تسلیم کیا تو پھر کیا وجہ ہے، کہ سرویا کے وحشی۔ ظالم یونانی اور بلغاری تو حقوق مساوات حاصل کریں اور ترکوں کے مطالبات پر تنازعہ ہو۔ میکسیکو جیسی ناتراشیدہ حکومت کو تو اپنی عدالت میں دیگر اقوام مغرب کے مقدمات کی سماعت کا حق حاصل ہو لیکن ترکوں سے مطالبہ ہوتا ہے کہ غیر ترکی لوگوں کے مقدمات اُن کی سماعت میں نہ آئیں اس سارے معاملے کی تہ میں اگر مذہب نہیں تو اور کیا شے ہے۔

جنگ عظیم تو ختم ہو گئی لیکن کون نہیں جانتا اس وقت بھی دنیا کے مختلف حصص میں وہ چنگاریاں سلگ رہی ہیں جو دنیا میں کسی دن آتش عظیم پیدا کرینگی دنیا جنگ سے تنگ آگئی ہے لیکن جنگ نسل انسانی کو نہ چھوڑے گی ہاں جنگ بہت حد تک رُک سکتی ہے اگر اسلام اور عیسائیت میں ایک قسم کا برادرانہ مفاہمہ ہو جائے، اور اسلام میں ایسے مفاہمے کے لئے بہت کچھ مواد موجود ہے ہم سیدنا مسیحؑ کو خدا کا ایک اُولوالعزم نبی اور واجب العزت رسول مانتے ہیں۔ قرآن انہیں وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ کلمۃ اللہ۔ روح اللہ کہتا ہے۔ ہم بلحاظ منصب نبوت آپ میں اور اپنے نبی صلعم میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کس طرح کریں جب خدا تعالےٰ کا ہمیں حکم ہے قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا

وَمَآ اُنۡزِلَ عَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَاۤ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ‌ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○ کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اُس پر ایمان لائے جو ہم پر اور ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ۔ یعقوبؑ اور اُس کی اولاد پر نازل ہوا اور ہم اُس پر بھی ایمان لائے جو موسیٰؑ عیسیٰؑ اور رب کے دوسرے نبیوں کو دیا گیا ہم اُن میں فرق نہیں کرتے۔ ہم خدا کے تابع ہیں +

اس حکم کے بعد ہم مسلمان نہیں رہ سکتے اگر ہم سیدنا محمدؐ اور سیدنا مسیحؑ میں کوئی تمیز کریں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہم اپنی محبت مسیحؑ علیہ السلام میں نصرانیوں سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں۔ جس وقت ہم آنحضرت صلعم پر درود وسلام بھیجتے ہیں ہم جناب مسیحؑ کو اور دیگر انبیاء کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ہم ہی جناب مسیحؑ سے حقیقی محبت اور اخلاص رکھتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسیحؑ خدا نہ تھے اور آج تو عیسائی دنیا بھی یہ ماننے کو تیار ہو گئی ہے۔ تو بہت سا جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ کیا اُس پاک وجود کو الوہیت کے ساتھ متصف کرنا یا انہیں مدعی الوہیت ٹھہرانا ایک قسم کا بہتان نہیں۔ درحقیقت یہ کوئی محبت نہیں۔ اصل محبت یہی ہے کہ ہم اپنے محبوب کو اُس کی اصلی حیثیت میں دیکھیں۔ مثلاً ایک شخص

کو جو بادشاہ کا بیٹا نہیں اُسے ایسا کہنا محبت کا نشان نہیں! یہ تو درحقیقت اُس کی ذات پر ایک حملہ ہے۔

فی الجملہ ایک طرف عیسائی اور ایک طرف ہم۔ جب دونوں گروہ سیدنا مسیحؑ سے محبت رکھتے ہیں۔ دونوں کی محبت کا نصب العین ایک ہی ہے، تو پھر کیوں ہم میں فساد ہو۔ کل تنازعات تو اُن کی ذات کے متعلق ہیں۔ کیوں نہ آشتی اور محبت سے اپنے محبوب کی اصلی حیثیت کو متحقق کر لیا جائے۔ اگر عیسائی احباب سے ہمارا کوئی تنازعہ ہے تو صرف اس لئے کہ بہت سی ایسی قدیمی روایات جن کا تعلق پرانے کفر و الحاد سے تھا۔ اور جو مسیحؑ سے ہزاروں برس پہلے۔ ایران۔ یونان۔ بابل۔ نینوا۔ کاینچ۔ سیریا۔ مصر۔ روما میکسیکو کی قصہ کہانیوں میں دائر و سائر تھیں وہ ہمارے پیارے مسیحؑ کے نام منسوب کر دی گئی ہیں۔ کیا ہمیں رنج پیدا نہ ہو کہ جو باتیں دنیا کے قدیمی ملحدوں نے سورج دیوتا یا دوسرے معبودوں کے متعلق بطور عقاید مذہب میں داخل کر رکھی تھیں وہ مسیحؑ کے مبارک مذہب میں آ داخل ہوئیں۔ مسیحؑ کا مذہب تو اسلام تھا لیکن اُس کی پاک ہستی بدقسمتی سے مذہب شناسی کا معبود بن گئی۔ میری اس کتاب کا موضوع درحقیقت یہی ہے جس پر آیندہ صفحات روشنی ڈالینگے۔ لیکن یہاں میں پھر بہ تکرار کہتا ہوں کہ عیسائیوں سے

ہمارا اختلاف محض محبت اور اخلاص کی بنا پر ہے۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ہم ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں اور ہم دنیا میں اپنے باپ کی عزت و تکریم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم میں کچھ اختلاف سا پیدا ہو گیا ہے۔ مسیح کے بعض بیٹے (عیسائی) جن وجوہ سے باپ کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ باتیں اس کے دوسرے بیٹوں (مسلمانوں) کے نزدیک باپ کے منزلِ شان ہیں بس یہی حقیقت تنازعہ ہے۔ اس رواداری کے زمانہ میں جب انسانی اخلاق اس قدر سلجھ چکے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی مخالف سے مخالف باتوں کو حوصلہ اور صبر سے سن سکتے ہیں اور اُن پر غور کر سکتے ہیں، تو پھر کیوں ہم اس امر متنازعہ فیہ کو فراخ دلی کے ساتھ تہ نہ کریں +

ان چند باتوں نے مجھے ان اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا میں اس وقت مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھا ہوں جہاں سے تیرہ سو برس ہوئے "یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الخ..." کی ندا اُٹھی اور نہایت ہی مبارک ثابت ہوئی میں آج اپنی آواز کو اُسی مقدس آواز کی ایک صدائے بازگشت سمجھتا ہوں۔ یہ ایک صلح اور آشتی کی ندا ہے جو ایک مسلم دل سے نکلی ہے اور رب کعبہ سے جس کے گھر کے سامنے بیٹھ کر میں نے یہ کتاب لکھوانی شروع کی ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس صدائے صوت مکہ کو مثمر ثابت کرے۔ آمین۔ ثم آمین +

میں یہاں حاجی ارباب احمد علی خاں صاحب سب جج پشاور کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جن سے میں نے یہ کتاب املا کرائی۔ میری صحت ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ میں اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکوں۔ احباب میرے لئے دعا فرمائیں۔

مکہ مکرمہ

۵۔ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ

مطابق ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۴ء

خواجہ کمال الدین

مشاہیر کلیسائے انگلستان کے معتقداتِ جدیدہ

جب سے میں انگلستان میں تبلیغ اسلام کے لئے گیا، تب سے مجھے اس بات کی ہمیشہ تلاش رہی، کہ مذہب کلیساء اور اُس کے اصول جو مسیحؑ کے نام پر آج دنیا میں پیش کئے جاتے ہیں، وہ کہاں سے لے کر مسیحی مذہب میں شامل کر دیئے گئے۔ مسیحؑ کی تعلیم کا جو نقشہ قرآن شریف پیش کرتا ہے، اناجیل اربع بھی قریب قریب جس کی مصدق ہیں۔ وہ تو اسلام کی ایک شکل ہے لیکن مختصراً کلیسا کی یہ داستان ہے کہ نسل انسانی فطرۃً گنہگار تھی جس کے باعث وہ ہلاکت میں تھی۔ اس ہلاکت سے خدا بچانا چاہتا تھا لیکن گناہ کی پاداش بھی ضروری تھی۔ آخر خدا نے یہی پسند کیا

کہ گناہ کی سزا وہ خود بھگتے۔ اس لئے اُس نے کنواری کے پیٹ سے جنم لیا۔ انسانی صورت میں صلیب پر چڑھا۔ دنیا کی لعنت کو اپنے پر لیا۔ سزا کی کمی پوری کرنے کے لئے دو دن دوزخ میں رہا۔ اس طرح کفارۂ گناہ کو پورا کر کے پھر زندہ ہوا۔ اب جو شخص اس داستان پر ایمان لائے خواہ عمل کرے یا نہ کرے وہ نجات پالے گا۔ پھر مسیحؑ کے کسی واقع کی یاد میں عشاء ربانی ہوتی ہے اُس میں جو شریک ہو جونہی اُسکے حلق سے مقدس روٹی کا ایک ٹکڑہ اور شراب کا ایک قطرہ اُتر جائے تو اُس کے جسم میں مسیحی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ مسیحی مذہب کا ٭

یہ باتیں تو ہندوستان کے کئی مشرک فرقوں میں جستہ جستہ نظر آتی ہیں۔ مسیحؑ جیسے موحد انسان کی تعلیم میں کیسے آ داخل ہوئیں؟ ان کی جھلک پولوس کی تعلیم میں ضرور ہے لیکن اُس کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے؟ میری حیرت اور بھی بڑھ گئی جب میں نے گذشتہ پانچ چھ سال میں مشاہیر کلیسا کو آہستہ آہستہ اُن باتوں کی مخالفت پر، اور اُن کو چھوڑتے دیکھا۔ خصوصاً اگر گذشتہ چھ سات سال کی اُن حرکات پر توجہ کی جائے، اور اُن افعال و اقوال کو بنظر غور دیکھا جائے جو کلیسا کی چوٹی کے آدمیوں سے سرزد ہوئے تو ایک انسان آسانی سے اس نتیجے پر آ سکتا ہے۔ کہ یہ واجب الاحترام بزرگ بھی سمجھ چکے ہیں کہ مروجہ تعلیماتِ کلیسا کو مسیحؑ سے

کوئی تعلق نہیں اور ان کے خیال میں خواہ وہ غیر صحیح ہی کیوں نہ ہو کلیسا کو چھوڑنا
یا اس کا توڑنا بہت سی سیاسی اور ملکی مصلحتوں کے لئے ضرر رساں ہو گا۔ دل کے
بھید تو خدا ہی جانتا ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ کلیسا کو قایم رکھکر
اس کو کل متدائرہ تعلیم سے پاک کر دینا چاہتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یہ مشاہیر ملک
کو عیسائی بھی دیکھنا چاہتے ہیں، اور ہر ایک ایسی تعلیم کو جو صدیوں سے جناب مسیحؑ
کے نام پر دی جا رہی ہے اس کو لوگوں کے دل سے نکال کر اس کی جگہ کوئی نئی
تعلیم اب ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ تعلیم تو یقیناً تعلیم اسلام ہی ہو گی لیکن وہ مسلمان
کہلانا نہیں چاہتے لیکن مذہب کا بنانا خدا کا فعل ہے۔ اور بیت عنکبوت ٹوٹ کر
رہے گا +

ان باتوں نے مجھے اور بھی اس امر کی تلاش میں لگا دیا کہ یہ مواد جو اس وقت
مشاہیر کلیسا کے نشتر تلے آچکا ہے، کہاں سے کس وقت۔ اور کیوں جسم نصرانیت
میں آ داخل ہوا۔ خدا کا احسان ہے کہ میری تحقیق ٹھکانے لگی اور قیام مکہ معظمہ کی برکت
میرے لئے بہت سے انکشافات کا موجب ہو گئی۔ لیکن میں اپنی تحقیق کے نتائج
لکھنے سے پہلے ان اوراق کے پڑھنے والوں کو کلیسی مشاہیر کے موجودہ خیالات
اور معتقدات سے اطلاع دینا چاہتا ہوں +

ابھی یورپ میں جنگ شروع نہ ہوئی تھی کہ بعض مسیحی علما مروجہ تعلیم کلیسا سے غیر مطمئن ہو گئے انہوں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھیں۔ دیگر مسیحی علما کو مخاطب کیا کہ وہ کلیسی تعلیم کی اصلاح کریں۔ اُن میں سے ایک مشہور فاضل جرمنی کے ڈاکٹر **یوقن** تھے۔ اُن کی تصنیف نے جو ۱۹۱۳ء میں نکلی طبقہ علماء میں ایک ہلچل ڈالدی انہوں نے علی الاعلان یہ لکھا کہ عیسائی کلیسا کے حالات اندرونی سخت اصلاح طلب ہیں اگر کلیسا کی تعلیم کو درست نہ کیا گیا تو مسیحیت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ یہ کتاب اس وقت میرے لئے حیرت افزا واقع ہوئی۔ میں حیران تھا کہ وہ کونسی باتیں مسیحی مذہب میں ہیں جو ڈاکٹر موصوف کے نزدیک چھوڑنے کے قابل ہیں۔ اس پر چند ماہ گذرے تھے کہ مجھے پیرس میں ایک مذہبی کانفرنس کی شمولیت کے لئے بلایا گیا۔ علمائے مغرب کا وہ ایک ممتاز جلسہ تھا۔ قریبًا کل کے کل آہبات کے ڈاکٹر اور فاضل وہاں جمع تھے وہ سب کے سب مروجہ مسیحی تعلیم سے بیزار ہو کر کسی صحیح مذہب کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ میرا انہوں نے خیر مقدم کیا میری تجویزوں کو توجہ سے سُنا۔ ہم نے ایک لمبی سکیم اپنے سامنے رکھی لیکن جنگ عظیم نے پیدا ہو کر یہ سب کی سب باتیں برطرف کر دیں +

اس جنگ نے دنیا کی کل اقوام وملل کو میدان حرب میں لا جمع کیا۔

جنگ میں شریک ہونے والوں نے میدان جنگ میں دیکھا کہ جن مسلمانوں کو وہ
پیگن (کافر وملحد) سمجھتے تھے وہ عیسائیوں سے کہیں زیادہ خدا پرست تھے جہاں
عیسائی سپاہی میدان جنگ کے خالی اوقات شراب و قمار اور دیگر غلط کاریوں میں
گزارتے تھے وہاں مسلم سپاہی نماز۔ اوراد۔ اذکار میں مصروف ہو جاتے تھے تین
چار سال تک تو جنگ کی طرف ہی طبائع لگ گئیں لیکن عین جنگ میں
بعض افراد کی توجہ زبور کے بعض حصص کی طرف منعطف ہوگئی جو بائیبل میں جناب داؤد
علیہ السلام کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ اور جو عیسائی کتاب الصلوٰۃ میں درج ہیں
ان میں طرح طرح کی بد دعائیں دشمنوں کے حق میں تجویز کی گئیں ہیں اور ہمیشہ سے
گرجوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ ضرور تھا کہ جنگ میں یہ زبور بطور دعا پڑھی جائے ان
بعض ضمیریں گھبرا اٹھیں چاروں طرف سے یہ آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ اس قسم
کی بد دعائیں اور لعنتیں تو خدا کی طرف سے الہام نہیں ہو سکتیں۔ خود بعض پادریوں
نے اپنی کتابوں میں سے ان کو قلمزن کر دیا۔ خصوصاً زبور نمبر ۵۸ کو آخر کار کلیسا کو یہ
باتیں کتاب الصلوٰۃ سے خارج کرنی پڑیں۔ عیسائیوں کی کتاب صلوٰۃ تو روز نئی بنتی
رہتی ہے اس وقت بھی پھر اس کی تبدیل و تنسیخ زیر غور ہے لیکن زبور تو الہامی کتاب
مانی گئی تھی، اور بائیبل کا ایک حصہ ہے اس لئے اُس کے خدا کی طرف سے نہ سمجھے

جانے نے انجیل و تورات کی صحت پر از سر نو شکوک پیدا کر دیئے۔ یہ بھی کہا گیا۔ کہ
یونسؑ کی مچھلی کا قصہ بھی صحت سے معرّا ہے پچھلی صدی میں بھی اس پر شکوک پیدا ہوئے
لیکن وہیل مچھلی کے قبضہ انسانی میں آ جانے نے متشکک طبائع کا جواب پیدا کر دیا
چنانچہ جناب یونسؑ کے قصہ بائیبل میں جہاں مچھلی کا ذکر تھا وہاں مترجمین نے لفظ وہیل
لفظ مچھلی کی جگہ رکھ دیا۔ وہیل اس قدو قامت کی مچھلی ہے کہ اگر اس کے قدو قامت کے
لحاظ سے اس کا گلا اور شکم قیاس کر لیا جائے تو ایک نہیں کئی انسان اس کے اندر
جا سکتے ہیں اس طرح سے ماہی یونسؑ کے متعلق حضرت یونسؑ کے نگل جانے کی دقت
طے ہو گئی۔ بد قسمتی سے چند سال کے بعد یہ بات علم میں آ گئی کہ وہیل جسامت میں
گو کل مچھلیوں سے بڑی ہے لیکن اس کا گلا اس قدر چھوٹا ہے کہ اس کی خوراک چھوٹے
سے چھوٹے دریائی کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں وہ اپنا منہ کھول کر میلوں پانی لیتی
ہوئی سمندر میں چلی جاتی ہے۔ پانی تو اس کے گلپھڑوں کے ذریعے باہر نکلتا جاتا
ہے لیکن پانی کے ساتھ جو کیڑے مکوڑے اندر چلے جاتے ہیں وہ ایک قسم کی
جالی نما چیز کے ذریعے اندر رہ جاتے ہیں جب یہ صورت ہے تو وہیل نے جناب
یونسؑ کو کیا نگلنا تھا۔ آخر کار ترجمہ بائیبل سے لفظ وہیل کاٹ کر پھر لفظ مچھلی ڈالنا پڑا۔
یہ باتیں آخر کب تک قایم رہ سکتی تھیں۔ علم و عقل نے اس کی مخالفت کی۔ خود

پادریوں نے اس قصہ کو بے بنیاد تسلیم کیا۔ اور غالباً کنٹربری میں ہی جو آرچ بشپ
کا مقام ہے یہ امر زیر بحث آیا۔ توریت کے اس قصے کو تو آسانی سے پادری متروک
اور الحاقی سمجھ سکتے تھے۔ لیکن وہ جناب مسیحؑ کے قول کو کیا کرینگے جہاں وہ اس قصہ
کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اس قوم (یہودی) کو کوئی نشان نہ دیا
جائے گا۔ مگر وہ جو یونسؑ کی قوم کو دیا گیا" یعنی جس طرح مچھلی کے پیٹ میں جناب
یونسؑ رہے اور پھر دو تین دن کے بعد اُس میں سے نکلے اُسی طرح ابن آدم (مسیح)
تین دن زمین میں رہے گا اور وہاں سے نکلے گا +

یہ امر مسلم ہے کہ عیسوی مذہب کے کونے کا پتھر مسیحؑ کا قبر سے نکلنا ہے، پھر یہ مسیحؑ کی
ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے۔ آپ نے اس واقع کو یونسؑ کے واقع کے ذریعے شرح
کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مسیحؑ قصہ یونسؑ کو صحیح سمجھتے ہیں
دوسری طرف مسیحی علما اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ اب ہم جناب مسیحؑ کے متعلق کیا خیال کریں
ہمارے نزدیک تو یہ ایک نبی کی بھی شان سے بعید ہے کہ اُس پر قصہ یونسؑ کی صحت
یا اُس کا غلط ہونا منکشف نہ ہو۔ چہ جائیکہ مسیحؑ کو خدا یا ابن خدا خیال کیا جائے۔
اگر قصہ یونسؑ از قسم اباطیل ہے تو لازماً یہ پیشگوئی یا تو مسیح کی طرف سے نہیں۔ اور
یہ باتیں بعد میں انجیل کے ساتھ ملحق کی گئیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ ورنہ معاذ اللہ

مسیح کی کوئی حیثیت قایم نہیں رہتی۔ یہ باتیں کہاں تک ضمیر انسانی کو دبا سکتی تھیں آخر ۱۵ جولائی ۱۹۱۷ء کو بمقام کنٹربری ایک کانووکیشن میں بصدارت آرچ ڈیکن ہشو یہ باتیں بڑی شد و مد کے ساتھ زیر بحث آگئیں ٭

انگلستانی کلیسا میں جب کوئی پادری ڈیکن بنایا جاتا ہے تو اُس سے بعض اظہار بطور سوال و جواب لئے جاتے ہیں۔ اُس میں تیسرا سوال و جواب حسب ذیل ہوا کرتا ہے۔ **سوال**۔ کیا آپ جو کچھ نئے پرانے عہد ناموں (بائیبل) میں ہے اُن سب کو بلا تصنع قبول کرتے ہیں **جواب** میں قبول کرتا ہوں۔ بیان یہ کیا گیا کہ اس قسم کے بیان دینے کے لئے اب پادری تیار نہیں جس سے مراد یہ تھی کہ وہ صحت بائیبل کو تسلیم نہیں کرتے اس سوال و جواب کی جگہ کمیٹی نے جو سوال و جواب تجویز کئے وہ حسب ذیل تھے **سوال** کیا آپ نئے پرانے عہد نامہ کی وہ تمام باتیں مانتے ہیں جو مختلف حصص میں اور مختلف طریق پر خدا کے اُس الہام کو لائی ہیں جس کی تکمیل عیسیٰ مسیح میں ہوئی **جواب**۔ ہاں اس نئے تجویز کردہ سوال نے کہاں تک انجیل توریت کی الہامی حیثیت کو گرا دیا وہ **ڈین آف کنٹربری** نے اس تجویز کی ایک ترمیم پیش کرتے ہوئے بیان کر دی اُنہوں نے کہا کہ یہ تجویز کردہ سوال کتب مقدسہ کے الہامی ہونے کی اہمیت پر زور نہیں دیتا حالانکہ ان کا

الہامی ہونا عیسائی مذہب کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس لئے انہوں نے سوال مجوزہ
کی بصورت ذیل ترمیم کردی **سوال**۔ کیا آپ قبول کرتے ہیں کہ نئے اور پرانے
عہدنامجات کے صحائف مقدسہ خداتعالیٰ کے الہام سے ہیں اس پر کرائیسٹ چرچ کے
ڈین نے کہا کہ یہ تو اسی سوال کی دوسری شکل ہے جس کو ہم بدلنا چاہتے ہیں بہر
حال اسپر ووٹ لئے گئے پانچ نے تو ڈین آف کنٹربری کی حمایت کی لیکن ترسیٹھ
پادریوں نے مخالفت کی یہ سب کچھ کنٹربری میں ہوا جو انگلستان میں کلیسا کا سرچشمہ ہے
اُس سے یہ امر تو فیصل ہو گیا کہ نوے فیصدی مسیحی علما موجودہ انجیل و توریت کو کل کا کل
خدا کی طرف سے نہیں مانتے۔ بہت رد و کد کے بعد سوال کی شکل ذیل منظور ہوئی
"کیا آپ پرانے عہدنامجات کی اُن باتوں کو مانتے ہیں جو مختلف حصص ہیں اور مختلف
پیرایوں میں خدا کے اُس الہام کو لائیں جو ہمارے خداوند مسیحؑ میں پورا ہوا +
یہ امر تو ظاہر ہے کہ معلمین مسیحیت میں سے نوے فیصدی موجودہ انجیل و توریت
کو کل کا کل الہامی نہیں مانتے یہ لوگ انجیل توریت کی صرف وہ باتیں ماننے کو تیار
ہیں جن سے مسیحؑ کی ذات اور اُن کے متعلق ان کے معتقدات ثابت ہوتے ہیں
خدا کی شان ہے کہ انسان جب صحیح اور معقول عقاید سے تمسک نہیں کرتا تو علم و
دانش سے بھی الگ ہو جاتا ہے۔ یہ پادری صاحبان تمام کے تمام یونیورسٹیوں کے

گریجوئیٹ ہیں۔ ان کے اپنے نصاب تعلیم میں منطق اور علم کلام ہے۔ انجیل و توریت کے باقی حصص کو غیر الہامی قرار دے کر یہ کس طرح اُن حصص کو الہامی مان سکتے ہیں جن میں مسیح کا ذکر ہے اگر تو دنیا کی کسی اور کتاب یا صحیفے میں جناب مسیحؑ کا ذکر ہوتا، تو اس کی تطبیق پر انجیل و توریت کے وہ حصص مان لئے جاتے، جو مسیحؑ کے متعلق ہوتے۔ لیکن یہ تو صورت نہیں۔ انجیل توریت کے سوا کسی اور کتاب میں مسیحؑ کا پتہ نہیں چلتا ہاں یہودی مورخ جو **سیفس** کی تاریخ میں ایک آدھ ورق مسیحؑ کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن وہ ورق آج خود ارکان کلیسا کے نزدیک بھی جعلی ثابت ہو چکا ہے اس کے علاوہ کتبخانہ پوپ (روما) میں ایک چٹھی بھی موجود ہے۔ جو پیلاطوس کی طرف سے قیصر روم کے نام لکھی ہوئی بیان کی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ چٹھی اور اس پر پیلاطوس کے دستخط دونوں آج جعلی قرار دئے جا چکے ہیں پھر توریت انجیل کے سوا جناب مسیحؑ اور اُن کی حیثیت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ قرآن کریم ایک بعد کی کتاب ہے۔ علاوہ ازیں کتاب حمید اُن کے لئے کوئی سند نہیں۔ اب اگر کوئی ان سے پوچھے کہ مسیحؑ کو کیوں مانتے ہو، تو اس کا جواب ملے گا کہ انجیل توریت کے بعض حصص کی بنا پر، پھر اگر یہ پوچھا جائے کہ توریت انجیل کے ان مختصہ حصص کو کیوں مانتے ہو، تو اس کا جواب یہ دینگے کہ اُن میں مسیح کا ذکر ہے کیا یہ تسلسل دوری یا مصادرہ الی المطلوب نہیں یہ تو ایک موٹا

منطقی مغالطہ ہے اس امر پر میں نے اسلامک ریویو جلد نمبر ۵ میں مفصل بحث کی ہے
بہر حال کنٹربری کی اس کانووکیشن نے جو در اصل انگلستانی کلیسا کی قایم مقام تھی قرآن
کریم کی صداقت پر مہر کر دی - قرآن کریم نے بھی تو یہی کہا تھا کہ انجیل توریت میں تحریف
ہو گئی ہے، لوگوں نے خود ہی بعض باتیں لکھکر خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں، یہ تو نہیں
کہا کہ یہ کتابیں کل کی کل انسان نے بنائی ہیں - قرآن مجید نے ان کتابوں کو خدا کی
طرف سے ہدایت سے خالی نہیں کہا بلکہ فرمایا فیہا ھدًی و نور یعنی اس میں نور اور ہدایت بھی
ہے *

اگر مذہب انسان کے لئے ایک پیاری سے پیاری چیز ہے، اور انسان طبعاً
چاہتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اس کی اصلی شکل و صورت میں دیکھے، تو پھر کیا قرآن
نے دنیا پر احسان نہیں کیا، اور خصوصاً عیسائیوں کے ساتھ محبت کا سلوک نہیں
کیا، جب اُن کو اطلاع دی کہ جس کتاب پر تم اپنے مذہب اور ایمان کا حصر رکھتے ہو
وہ قابل اعتبار نہیں - یہ باتیں اگر اس وقت مان لی جاتیں تو دنیا کی تاریخ کچھ اور
ہوتی - لیکن میں تو اب بھی ان لوگوں کی دل سے عزت کرتا ہوں، اور اُن کی اخلاقی
جرأت کا مداح ہوں جس وقت بھی اُن پر حقیقت کا انکشاف ہوا، وہ اپنے
غلط معتقدات سے الگ ہو گئے - اور دنیا کو اس سے اطلاع دیدی - چنانچہ ۱۹۲۲ء

ہیں **وسٹ ملنسٹر** گرجا کے **ڈین** نے (جو لنڈن کا شاہی گرجا ہے) بچوں کے نصاب تعلیم کے مذہبی حصے پر بحث کرتے ہوئے ایک جلسہ میں فرمایا کہ "اگر ہم اِس نصاب میں کتاب پیدایش کی کہانیاں رکھ دیں، تو آیندہ نسل یہی سمجھے گی، کہ ہمارا معیارِ صداقت بہت ہی ادنےٰ درجے کا تھا" یہ معنی خیز فقرہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کتاب پیدایش کی کہانیاں اس فاضل الٰہیات کے نزدیک خالی از صداقت ہیں لیکن مشکل تو یہ ہے کہ کلیسا نے اپنے مذہب کی بنیاد اُن اصولوں پر رکھی ہے جن کے لئے اُن کہانیوں کو صحیح ماننا ضروری ہے +

مذہب کی بنیاد الوہیت مسیحؑ اور کفارۂ مسیحؑ ہے۔ اور کفارہ کی ضرورت گناہ آدم سے پیدا ہوتی ہے۔ میں مقبولہ مسیحی مذہب کی کہانی ذیل کے دو لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔ آدم نے گناہ کیا۔ یہ گناہ انسان کی فطرت میں آگیا۔ اس سے انسان مستوجب سزاے ابدی ٹھہرا محبت خدا نے عذاب سے بچانا چاہا۔ عدل کے تقاضے نے سزا چاہی۔ کفارہ کی ضرورت پڑی۔ کوئی اور انسان فطرتاً گنہگار ہونے کے کفارہ نہ ہو سکتا تھا آخر خدا خود کفارہ ہوا +

اس داستان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسی مذہب کا بنیادی پتھر قصہ آدم مندرجہ کتاب پیدایش ہے۔ اب اگر قصہ آدم ہی بقول **ڈین** ویسٹ منسٹر غلط ہے

تو پھر کل مسیحیت کی کہانی غلط ہو جاتی ہے۔ خیر یہ امر تو آج ڈین موصوف نے کہا لیکن **گناہ فطرتی یا موروثی** کے مسئلہ سے تو مدتوں پہلے اکثر فضلائے مسیحیت نے انکار کر رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کا درود و سلام اُس افضل البشر انسان پر ہو، جس نے دنیا کو یہ بشارت دی، کہ ہر ایک انسانی بچہ، خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہو، دنیا میں صحیح فطرت لے کر آتا ہے خدا کا احسان ہے، کہ عیسائیت کا یہ بنیادی عقیدہ، یعنی گناہ موروثی ہے، قریب قریب علمائے نصرانیت کے طبقہ سے مٹتا جاتا ہے۔

یہ زمانہ علم و فضل کا ہے۔ مغربی دنیا انجیل کی ہر ایک بات ماننے کو تیار نہیں۔ قرآن کریم اگر انجیل کے محرف ہونے کا پتہ نہ بھی دیتا، تو بھی بعض انجیلی روایتیں اُسے الہامی پایہ سے گرا دیتیں۔ ہم مسیح کو خدا کا پیارا نبی مانتے ہیں۔ ہم انجیل کی کسی ایسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں، جو نبی کی شان کے شایاں نہ ہو۔ نبی اخلاق حسنہ کا ایک نمونہ ہوتے ہیں۔ اخلاق منزلیہ چاہتے ہیں کہ بیٹے والدین کا ادب کریں۔ خصوصاً والدہ کی عزت کریں، قرآن مجید اطاعت میں خدا کے بعد والدین کا مقام قرار دیتا ہے لیکن انجیل میں جناب مسیحؑ، مریمؑ صدیقہ سے کچھ ایسی بے رخی اور بے مہری کرتے ہیں، جو پسر اللہ اخلاق سے بہت بعید ہے۔ یا یہ قصہ الحاقی ہے۔ یا جناب مسیحؑ شان نبوت سے گر جاتے ہیں۔ قرآن مجید اس واقعۂ انجیل کی تردید کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ مسیحؑ اپنی والدہ کی بہت

عزت و توقیر کیا کرتے تھے ہم مسیح کو نبی تو ہی قرار دے سکتے ہیں جب انجیل کی ایسی روایات کو غلط قرار دیں

خیر ہم تو انبیا علیہم السلام کے متعلق ایک خاص عزت دل میں محسوس کرتے ہیں

لیکن ہم اکابر علمائے مسیحیت کو کیا کہیں جو خود مسیح کے متعلق بعض وقت بری طرح منہ کھول دیتے ہیں

آج کل انگلستان میں مسئلہ طلاق پر گفتگو ہو رہی ہے۔ انجیل میں جناب مسیح کے ایک فقرے

نے مسئلہ طلاق میں ایک خطرناک مصیبت ڈال رکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس مرد

و عورت کو خدا نے ملا دیا اُسے کوئی جدا نہیں کرسکتا" اس ارشاد کے ماتحت طلاق

ایک امر ناممکن ہے۔ حالانکہ بعض حالات، طلاق کی از حد ضرورت پیدا کر دیتے ہیں

کل عیسائی دنیا نے تو قریباً اس ارشاد کو پس پشت کر دیا، لیکن انگلستان اس معاملے

میں ڈگمگاتا رہا۔ ہاں اب دوسرے عیسائی ملکوں کی طرح انگلستان بھی اسلامی صورت

طلاق کی طرف آرہا ہے۔ بہرحال اس وقت اس مسئلہ پر بڑی شد و مد سے بحث

ہو رہی ہے اس کے ضمن میں بشپ آف ڈرہم مسیح کے ارشاد بالا کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "**اگر مسیح ہمارے زمانے میں ہوتا تو زیادہ**

عقلمندی سے کام لیتا" العظمت للہ۔ کلیسا کا بشپ جو مسیح کو خدا بھی

کہے اور یہ باتیں بھی کہے۔ میری اسلامی غیرت جو ہر مسلم دل میں جناب مسیح سے ہے کب

گوارا کرتی تھی، کہ میں یہ بات سنوں اور خاموش رہوں چنانچہ اسلامک ریویو کے

ذریعے میں نے بشپ موصوف کو اطلاع دی، کہ جناب مسیحؑ تو اپنے زمانے کے دانا اور بہترین انسان تھے، وہ آج بھی ویسے ہی ہوتے۔ اُنھوں (مسیحؑ) نے اِس ارشاد کے ذریعے یہودیوں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، جو ہر روز طلاق دیتے اور نیا نکاح کرتے تھے۔ یہ تو ایک وقتی حکم تھا۔ البتہ تم لوگ جاہل اور نادان ہو، جو خدا کے نبی کو اس طرح یاد کرتے ہو۔ یہ تو تمہارا قصور ہے، کہ تم نے پہلے نامعقول باتیں اُن کی طرف منسوب کیں، یا وقتی باتوں کو قطعی قرار دیا، اب تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ اور مسیحؑ کو مطعون کرتے ہو +

قرآن کریم نے ایک اور بات بھی مسیحؑ کے متعلق بیان فرمائی ہے۔ دنیا اُسے اگر پہلے ہی تسلیم کر لیتی تو آج عیسائی، مسلمانوں میں یہ جھگڑے کیوں پڑتے۔ بروئے قرآن مجید قیامت کے دن مسیحؑ سے خدا دریافت فرمائے گا۔ کہ کیا تو نے اپنی اور اپنی ماں کی الوہیت کی تعلیم لوگوں کو دی تھی وہ اس امر سے انکار کرے گا اور کہے گا کہ یہ مذہب میرا تعلیم کردہ نہیں وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ ان آیات سے مراد ہے، کہ جو کچھ کلیسائے مغرب، اور اُس کی اتباع میں عیسوی دنیا، جناب مسیحؑ کے نام پر تعلیم دے رہی ہے اُس کو آپ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، قرآن مجید کی اس تعلیم کو بھی آخر کار عیسائی دنیا نے آج تسلیم کرلیا۔ ۹ اگست ۱۹۱۷ء کو گرٹن کالج کیمبرج میں ایک دلچسپ جلسہ منعقد ہوا جس میں چوٹی کے پادریوں نے حصہ لیا سینٹ پال کے گرجا کے بڑے پادری **ڈین انجی** صاحب نے جو ایک مشہور فاضل ہیں ایک تحریر پڑھی، سوال زیر بحث یہ تھا کہ کیا مسیحؑ نے موجودہ کلیسا قایم کیا **ڈین** موصوف نے دوران تقریر میں بیان کیا کہ مسیحؑ اپنے معاصرین میں ایک نبی کی حیثیت میں ظاہر ہوئے انہوں نے کبھی موسوی تعلیم سے انحراف نہیں کیا، نہ کوئی نئی تعلیم دی نہ موسوی مذہب کے مقابل کوئی نیا مذہب قایم کیا۔ روحانی معاملات میں وہ بالضرور آزادی چاہتے تھے، لیکن اپنے ملک اور وقت کی باتوں کو انہوں نے قبول کیا۔ اس پر موسوی مذہب سے جدائی تو ایک لازمی امر تھا، لیکن مسیحؑ نے عیسائیوں کے لئے کوئی اصول یا تعلیم خود تجویز نہیں کی، **ڈین انجی** کے ان الفاظ سے صاف نظر آتا ہے کہ مروجہ کلیسی تعلیم کو جناب مسیحؑ سے کوئی تعلق نہیں۔ حاضرین جلسہ میں سے صرف ایک بزرگ پادری جے۔ آر **ولکنسن**

کا جواب اس سوال پر کہ "آیا مروجہ کلیسا کا بانی مسیحؑ ہے" اثبات میں تھا۔ باقی سب اصحاب کا جواب نفی میں ہیں۔ انجیل کے خود دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلیسا کی یہ باتیں مسیحؑ کی نہیں۔ یہ تو **پولوس** کی باتیں ہیں جس نے مسیحؑ سے نہیں، بلکہ مسیحؑ سے پہلے کے فلسفے سے لیں۔ اناجیل ثلاثہ کا مسیحؑ، اور پولوس کا مسیحؑ، دو متضاد شخصیتیں ہیں مسیحؑ شریعت منواتا ہے۔ پولوس شریعت چھڑواتا ہے۔ روس۔ کا مشہور مصنف **کاؤنٹ ٹالسٹائے** جو مسیحؑ اور پولوس کو ایک وقت قبول نہ کر سکتا تھا۔ آخر اُس نے اس لاینحل امر کو یوں طے کیا۔ کہ اس نے پولوس کو جواب دیدیا۔ فی الواقعہ اگر پولوس کی تحریر کو ایک طرف کر دیا جائے تو پھر ایک منٹ کے لئے بھی یہ نظر نہیں آتا، کہ مسیحؑ کے اپنے الفاظ کہاں تک اُس مذہب کے متحمل ہو سکتے ہیں جو آج مسیحؑ کے نام پر دنیا میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ مسیحؑ کے الفاظ تو آپ کو خدا نہیں بناتے۔

جب انگلستان کے بڑے بڑے معلمان مسیحیت نے من وجہٖ یہ قرار دے دیا کہ موجودہ مذہب کلیسا کو مسیحؑ سے کوئی تعلق نہیں، تو اس کے بعد اُن کا یہ فرض بھی تھا کہ مسئلہ الوہیت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ یہ امر آخر کار بمقام آکسفورڈ اگست ۱۹۲۱ء میں پادریوں کی ایک کانگرس نے فیصلہ کیا۔ اور مسیحیت کے ایک فاضل ڈاکٹر

ریشنڈل ڈین کارلائل اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے مقرر ہوئے آپ
نے فرمایا، کہ اگر ہم مسیح کے نام یا ذات کے ساتھ الوہیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں
تو اس لفظ کے مفہوم میں ذیل کی باتیں کبھی ذہن میں نہیں رکھتے۔ **اوّل** جناب عیسےٰ
نے کبھی اپنی ذات کے لئے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے آپ
(مسیح کو) کہتے رہے ہوں اور اُس نے اُنہیں نہ روکا ہو۔ مگر جو باتیں اُس کے اپنے مُنہ
سے نکلی ہیں، خواہ وہ نازک سے نازک وقت پر کیوں نہ تھیں۔ اُن سے صاف پایا
جاتا ہے۔ کہ جناب عیسیٰ خدا کے ساتھ اپنا رشتہ، خدا اور انسان کا سمجھے۔ چوتھی انجیل
(یعنی یوحنا) ہیں، اگر اُن کی بعض تقریریں اس بات سے آگے جاتی ہیں تو وہ تاریخی
پایہ سے گری ہوئی ہیں[1] **دوم**۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ مسیح ہر معنوں میں انسان تھے
وہ جسماً ہی خدا نہ تھے، بلکہ اُن کی روح۔ قوت تعقل قوت ارادی سب انسانی تھی
سوم۔ یہ بھی قدیمی عقیدہ نہیں کہ مسیح کی انسانی روح، ازل سے موجود ہے۔ ہاں
اگر کل انسانوں کی روحیں قدیم سے موجود ہوں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے لیکن

---

[1] اس میں شک نہیں کہ انجیل یوحنا میں بعض فقرے ایسے ہیں جن سے مسیح کے مناد آپ کی الوہیت
ثابت کرتے ہیں ڈین موصوف کے نزدیک یہ انجیل تاریخی حیثیت نہیں رکھتی تثلیث کا ثبوت بھی ہر
انجیل کی ایک دو آیات سے نکالا جاتا ہے، لیکن یہ آیتیں پرانے نسخوں میں نہیں مترجمان انجیل نے شاہ
جیمس کے زمانہ میں جعلی تسلیم کیں۔ اور حاشئے کے نوٹ میں ایسا تسلیم کیا۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیوں اس
حاشیہ کو مروجہ انجیل یوحنا میں نہیں دیا جاتا ÷

یہ مسلمہ عقیدہ نہیں۔ **چہارم** الوہیتِ مسیح سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ بن باپ ضرور ہی تھے، یا صاحبِ معجزہ تھے۔ اگر تاریخاً اُن کی پیدائش ایسی ہی ثابت ہو تو بھی یہ الوہیت کا مظہر نہیں۔ اور اگر یہ امر ثابت نہ ہو، تو اس سے بھی اس مسئلہ میں فرق نہیں آتا۔ **پنجم** مسیح کی الوہیت علمِ غیب، یا علمِ کل پر مشتمل نہیں۔ اس بات کے فرض کرنے کی بھی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ مسیح کا علم اپنے معاصرین سے کوئی زیادہ تھا (مثلاً) جنوں کا سر سے نکالنا۔ (آج اگر) اسے ایک دماغی مرض سمجھا گیا ہے (اور مسیح کے معاصر اُسے جن سمجھے تھے)، تو مسیح بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آج اگر توریت کی پہلی پانچ کتابوں اور مزامیر کے مصنف کے متعلق کوئی اور رائے ہے، تو اس سے بھی مسیح ناواقف تھے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ جناب مسیح کو کچھ آیندہ کی توقعات تھیں لیکن تاریخ نے اُنہیں پورا نہیں کیا۔

حیرت کا مقام ہے کہ اس تقریر کے بعد لفظ الوہیت کے مفہوم میں کونسی بات رہ جاتی ہے جو مسیح کو خدا بنائے۔ نفس ناطقہ سے انسان حیوان میں تمیز ہوتی ہے نفس ناطقہ کی تین بڑی صفات رُوح، عقل اور قوت ارادی ہیں۔ اب اگر بقول **ڈین** مسیح میں یہ تینوں باتیں اُسی قسم کی ہیں جو انسان میں ہوتی ہیں، تو پھر وہ کن معنوں میں خدا ہے۔ اگر اُن کی روح کی پیدائش بھی اُن کے جسم کے ساتھ ہی،

ہے جیسے کہ ڈین موصوف سمجھتے ہیں، تو ازلی۔ ابدی خدا نے انسان میں جنم نہیں لیا۔ مسیحؑ کے بن باپ ہونے سے ڈین موصوف انکاری نظر آتے ہیں لیکن بفرض محال اگر آپ کی پیدایش ایسی ہی تھی تو بھی ڈین کے نزدیک یہ کوئی وجہ خدائی نہیں ہوسکتی معجزات کا بھی یہی حال ہے لیکن ڈین موصوف نے جو بات فقرہ نمبر پانچ میں کہی ہے، اُس سے تو خدا چھوڑ مسیحؑ معاذ اللہ مجھے نبی بھی نظر نہیں آتے نبی تو خدا تعالیٰ سے علم لے کر آتے ہیں۔ لفظ نبی کے معنی یہی ہیں۔ یہ لوگ انسانی علم کو غلطی سے پاک کرنے آتے ہیں ڈین موصوف کے فقرہ پنجم کی مراد یہ ہے، کہ جناب مسیحؑ کے زمانہ میں مرض ہسٹیریا سے کوئی واقف نہ تھا۔ لوگ اسے جنوں کا یا دیوں کا آسیب سمجھتے تھے۔ مسیحؑ بھی یہی سمجھتا تھا۔ اُس کے معاصر توریت کی پہلی پانچ کتابوں کو جناب موسیٰؑ سے اور زبور کو جناب داؤد سے منسوب کرتے تھے۔ آج کی تحقیق نے یہ باتیں غلط قرار دی ہیں لیکن جناب مسیحؑ بقول ڈین اس امر میں دوسروں کی طرح غلطی میں تھے ڈین کی تیسری بات نے تو الوہیت چھوڑ، آپ کی نبوت کا بھی صفایا کر دیا۔ نبوت کے ایک معنی پیشگوئی کرنا ہے۔ اس میں ڈین کا مذہب یہ ہے، کہ جناب مسیحؑ نے جو اپنے آنے کے متعلق پیشگوئی کی تھی، وہ تاریخ نے ثابت نہیں کی۔ اب خدا کے لئے بتلاؤ، کہ کوئی مسیحؑ کو نبی بھی کیوں سمجھے ؟

میرا ہمیشہ سے یہ مذہب ہے کہ اگر قرآن کریم مسیحؑ۔ موسےؑ یا دیگر انبیاء علیہم السلام کو نبی نہ کہتا، تو اُن کے متعلق مروجہ صحائف کو دیکھکر میں اُن کو نبی نہ مانتا۔ اخلاقی تعلیم سے کوئی نبی نہیں بن جاتا۔ ایسی تعلیمیں تو دنیا کے بہت سے حکیموں نے پیش کی ہیں۔ نبی کا تو پہلا فرض ہے کہ انسانوں کو غلطی سے نکالے۔ قربان جاؤں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ قرآن کو دیکھو کس طرح صحیح علم کو دنیا میں لایا۔ کس طرح دنیا کے معتقدات بعض تاریخی واقعات بعض علمی معاملات الغرض ہر ایک امر ضروری کے متعلق صحیح اور سچا علم دیتا ہے۔ مروجہ غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ متنازعہ امور پر فیصلہ کرتا ہے۔ اور آج سائنس اور تحقیق اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اور باتوں کو تو چھوڑ دو، عیسائی معتقدات کے متعلق جو قرآن کریم نے فیصلے کئے، کیا آج ان معلمانِ مسیحیت نے، جن کا ذکر میں یہاں کر رہا ہوں، تصدیق نہیں کئے۔ کیا صرف انہیں باتوں سے آنحضرت صلعم کا علم، خدا کا دیا ہوا علم ثابت نہیں ہوتا۔ اور وہ نبی صلعم نہیں ٹھہرتے۔ نبی کا پہلا فرض یہ ہے کہ لوگوں سے سابقہ غلطیوں کو دور کرے۔ جناب مسیحؑ دنیا کو اپنا پیغام دے گئے۔ مگر ان کے بعد ہی اُن کے متعلق غلط تعلیمیں پیدا ہوگئیں، اُن کو اور اُن کی ماں کو خدا بنایا گیا۔ تثلیث کی تعلیم دی گئی، فطرتی گناہ، اور کفارہ کا مسئلہ تجویز کیا گیا، انہیں مصلوب اور معاذ اللہ ملعون قرار دیا گیا، مختلف معجزات اُن کی طرف

منسوب ہوئے، بائیبل کو لفظاً لفظاً الہامی مانا گیا، صرف ایمان کو عمل کے بغیر ذریعہ
نجات سمجھا گیا، شریعت کو لعنت تجویز کیا گیا، علم و حکمت کا نام سحر اور جادو رکھا گیا
توحید کے ماننے والوں کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ مذہب کے منوانے میں جبر کو جائز کیا گیا
باقی کل انبیا کو خاطی گنہگار، چور۔ بٹمار کہا گیا، خدا کے معصوموں (نوحؑ۔ لوط۔ داؤد و سلیمان)
کے متعلق گندے سے گندے قصے تراش کر بائیبل میں شامل کئے گئے۔ دو ہزار برس
کے عرصہ میں آج آہستہ آہستہ ان سب باتوں کو خود معلمان مسیحؑ نے غلط اور غیر صحیح
قرار دیا۔ ہاں یہ بھی یاد رہے، کہ یہ سب کی سب باطل باتیں مسیحؑ کی پانچویں چھٹی صدی
تک پیدا ہو چکی تھیں پس اگر خدا ہی سرچشمہ مذاہب ہے، اور اس مذہب میں جب ایسی
غلط باتیں شامل ہو جائیں جو انسان کی تباہی کا موجب ہوں، اور جو خدا جناب مسیحؑ تک
وقتاً فوقتاً اسی لئے نبی بھیجتا رہا ہو کہ انسانی علم کو غلطی سے پاک کرے۔ تو جب یہ باتیں
پانچویں صدی مسیحؑ میں پیدا ہو چکی تھیں، اور ساتھ ہی کل دیگر مذاہب کے صحائف غائب
یا محرف ہو چکے تھے، اور ان کی تعلیمات بگڑ یا مٹ چکی تھیں۔ تو کیا اس علیم و حکیم
خدا کا یہ فرض نہ تھا، کہ اس کی طرف سے کوئی **نبی** آکر انسان کو غلطی سے نکالے اگر
نبی اس بات کے لئے نہیں آتے تو پھر کس بات کے لئے آتے ہیں۔ اور اگر نبوت
کا مشن یہی ہے اور بیشک یہی ہے تو پھر اس نبی کا نام لو جو وقت پر آیا اور یہ مشن

پورا کر گیا۔ یا اُس کے (مسیحؑ کے) بعد آج تک کسی نے نمودار ہو کر ان خطرناک غلطیوں کا ازالہ کیا۔ ہاں محمدؐ صلعم عین وقت پر آئے۔ آپؐ کا ظہور چھٹی صدی عیسوی میں ہوا آپؐ نے ایک خدائے واحد کی تعلیم دی۔ تثلیث اور شرک کی مختلف تعلیموں کو اُڑا کر توحید کو صحیح معنوں میں قایم کیا۔ دنیا کے کل انبیاء کی عزت کی۔ اُن کو سچا۔ راستباز اور صالح بیان کیا۔ اُن کی تعلیم کو اور ایسا ہی کل دنیا کے مذاہب کو خدا کی طرف سے تسلیم کیا۔ سابقہ کتب مقدسہ کا محرف ہونا بتا کر اُن کی صحیح تعلیم پیش کی۔ انسان کو پیدائشا صحیح اور پاک فطرت والا بیان کیا۔ ایمان اور عمل کو لازم ملزوم ٹھہرایا۔ شریعت کی عزت کی۔ قوانین آلہیہ پر چلنے کے ساتھ نجات وابستہ کی۔ علم وحکمت کے سیکھنے کو جزو مذہب ٹھہرایا۔ ضمیر اور مذہب میں آزادی رائے کی تاکید فرمائی۔ اشاعت مذہب میں جبر کو حرام کیا۔ انبیا کے مکسوبہ کمالات کا دروازہ کل انسانوں پر کھولا۔ عالمگیر اخوت کو دنیا میں قایم کیا۔ ہمدردی انسانی کا نام مذہب رکھا۔ ذات۔ پات۔ زبان۔ قوم۔ ملک کے امتیاز کو اُڑا کر نسل انسانی اور راستبازی کو مایۂ شرافت بنایا۔ یہ چند باتیں میں نے امور بالا کو سامنے رکھکر لکھی ہیں لیکن اس سے زیادہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ میں آپؐ کی تعلیم کو اِس کتاب کے آخری حصہ میں دونگا۔ یہاں میں بالاختصار یہ لکھ دیتا ہوں، کہ دنیا کی کوئی تعلیم جو صحیح تھی، اُس کی آپؐ نے تائید فرمائی۔ اور دنیا کے

ہر ایک ایسے عقیدے یا تعلیم کی دلائل کے ساتھ بیخکنی کی، جو انسانی اخلاق، معاشرت یا بہبودی کے خلاف تھی۔ اور ہر ایسی صداقت کو جو مذہب کی روح رواں ہے۔ اور قریب قریب ہر ایک مذہب کے مسلمات میں سے ہے، مثلاً ہستی باری تعالےٰ تنزیل کتب آلہیہ۔ ملائکہ۔ رسالت۔ حیات بعدالموت۔ مسئلہ خیر و شر۔ بہشت دوزخ۔ ذمہ واری اعمال وغیرہ وغیرہ ان سب امور کو علمی اور منطقی دلائل کے ساتھ مبرہن فرمایا

اللّٰھم صل علیٰ محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین +

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ ڈاکٹر **رشڈل** کی تقریر کے بعد اور بھی تقریریں ہوئیں۔ اُن میں سے۔ یورنڈ میجر پرنسپل **رین ہال** آکسفورڈ نے اس مباحثہ میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ فرمائے انہوں نے کہا، کہ جناب مسیح نے نہ تو جسمانی معنوں میں ابن اللہ ہونے کا دعوے کیا، جیسے کہ بن باپ ہونے والے قصے سے اخذ کیا جاتا ہے، نہ انہوں نے ذہنی (روحانی) معنوں میں ایسا دعوے کیا، جیسے کہ **نیقیہ** کی کونسل نے قرار دیا۔ انہوں نے اخلاقی معنوں میں ایسے ہی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا ظاہر کیا، جیسے کہ ہر ایک انسان خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے یعنی انسان میں اور خدا میں ایک قسم کا باپ بیٹے کا رشتہ اس طرح سے ہے کہ انسان اُن اخلاق کو ظاہر کرے جو خدا کے ہیں"+

ان تقریروں نے کل عیسائی دنیا کو حیران کر دیا۔ ڈین موصوف کی تقریروں کو خوفناک سمجھا گیا، اور اس کے نتائج کو عیسوی کلیسا کی موت سے تعبیر کیا گیا۔ ڈین مذکور سے مختلف قسم کے مطالبے ہوئے۔ انہوں نے اس بات کی تشریح میں، کہ الوہیتِ مسیح سے مراد کیا ہے۔ اپنی تقریر کو اخبار ڈیلی ٹیلیگراف مورخہ ۲۲۔ اگست ۱۹۲۱ء میں چھاپ دیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ”خداوند کا علم انسان کے ذریعے ہوا یعنی انسانیت میں ربانیت کا رنگ ہے“ آپ نے کہا، کہ ”اگر ہر ایک انسان کسی حد تک مظہر خداوند ہے“، اور مختلف مذاہب کے بانی، اور دیگر بزرگ انسان ایسے مظہر ہوئے ہیں تو یہ بھی ممکن ہے، کہ ایک شخص میں اخلاق خدا ایک اعلیٰ اور بے عدیل پیمانے پر ظاہر ہوئے ہوں یہی ہم مسیح کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں“۔

اس پر میں نے ڈین مذکور کو لکھا کہ کیا آپ کی مراد یہ ہے، کہ جو ربانی جوہر ہر انسان میں ودیعت شدہ ہے، وہ جناب مسیح میں کامل طور سے ظاہر ہوا۔ اس کے جواب میں ڈین نے میری تشریح سے اتفاق نہ کیا۔ لیکن اپنی تقریر مجھے بھیج دی جس کا ملخص میں نے اوپر دے دیا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے انہیں لکھا کہ آپ کی مرسلہ تقریر کے پڑھنے کے بعد بھی میں اسی نتیجہ پر آتا ہوں۔ بہرحال آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کل خط و کتابت کو شائع کر دوں۔ چنانچہ یہ خط و کتابت

اسلامک ریویو میں شایع ہوگئی +

ڈین موصوف نے جس کا نام مسیحؑ کے معاملہ میں الوہیت رکھا ہے، اسلام اُسے کمال انسانی سے تعبیر کرتا ہے **ڈین** سے کہیں زیادہ فصیح الفاظ میں، اسی بات کو آنحضرت صلعم نے ایک مسلم کا نصب العین قرار دیا۔ آپؐ نے تخلقوا باخلاق اللہ کا وعظ ہر مسلم کو کیا ہے۔ ہمارے نزدیک تو انسانی زندگی کا مقصد یہی ہے۔ اور اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ امر اوروں انسانوں کے لئے ناممکن ہے، تو پھر مسیح کی آمد ہی ایک بیسود اور لاحاصل امر ٹھہرتی ہے۔ **ریورنڈ ڈاون** نے اس امر کو نہایت واضع طور پر صاف کردیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، کہ اگر ہم خدا کے بچے ہیں تو ہم میں الوہیت ہے لیکن اگر الوہیت مسیحؑ ہماری الوہیت سے الگ ہے تو پھر وہ ہم جیسا نہیں۔ لہذا ہم اُس جیسے نہیں ہو سکتے لیکن وہ تو ہمیں اپنے جیسا بننے کو کہتا ہے" الغرض عیسائی دنیا کے لئے شاید یہ نئی بات ہو لیکن وہ کون مسلمان ہے جو انسان میں مظہریت ربانی کے مسئلے سے ناواقف ہے۔ حدیث بالا کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر اخلاق خداوندی پیدا کرے

الغرض **ڈین** موصوف کا مفہوم الوہیت مسیحؑ ؛ اسلاماً کمال انسانی میں محدود ہے۔ کل قرآن کریم کی تعلیم کی منشا یہی ہے کہ انسان میں ربانی اخلاق ظاہر ہوں اور یہ محض نظریہ نہیں، بلکہ ان اوصاف کے متصف کل کے کل انبیاؑ صلحا۔ اور لکھو کھا

مسلم اولیا گزرے ہیں۔ اور ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے انسان دیکھے ہیں ڈین موصوف
کا یہ کہنا، کہ جناب مسیحؑ سے کل کے کل ربانی اخلاق ظاہر ہوئے، اور اس باب میں
کوئی انکا نظیر نہیں۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن اگر مسیحؑ کے متعلق ہمارے علم کا اخذ صرف ایک
انجیل ہی ہے، تو ڈین موصوف کی یہ بات صحیح نظر نہیں آتی۔ اول تو جب انجیلی بیانات
کی صحت سے ہی ڈین موصوف اور اُن کے ہم نواؤں کو، جن میں چوٹی کے پادری موجود
ہیں، انکار ہو، تو پھر انجیلی کہانی کی بنا پر کسی نتیجہ پر آجانا کس طرح صحیح ہے۔ دور کیوں جائیں۔
مارچ ۱۹۲۳ء میں ہی ڈین انجی (سینٹ پال کے بڑے پادری) نے ایوننگ سٹینڈرڈ
میں ایک مضمون لکھا جس میں آپ کہتے ہیں "معاملہ تصنیف میں کامیاب سے کامیاب
فریب، اگر کہیں ہوا، تو کلیسا میں ہوا۔ ابتدائے عیسائیت ہی میں ایک وقت آگیا، جب
کسی کتاب کی عزت تو یہی ہوتی تھی، جب اُسے کسی بڑے نام پر منسوب کردیا جائے؛
بکثرت جعلسازی شروع ہوگئی۔ اور آج ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے، کہ عہد نامۂ
جدید میں بھی جو کتابیں جن کے نام پر منسوب ہیں، وہ انہیں کی ہیں یا نہیں؛ پطرس
کا دوسرا خط تو بالاتفاق اس کا نہیں۔ اور عہد نامہ جدید کی بعض کتابوں کی صحت شبہ سے
خالی نہیں"۔ یہ ڈین انجی کے الفاظ ہیں۔ جب مذہب کی بنیادی کتب ہی مشتبہ ہیں
تو پھر ان کے مطالب پر ایمان لانا کہاں تک صحیح ہے۔ انجیل نے جو نقشہ جناب مسیحؑ کا کھینچا

ہے، اول تو وجوہ بالا سے قابل تسلیم ہی نہیں بیکن اگر اُسے صحیح بھی مان لیا جائے، تو
بھی انہیں اخلاق ربانی کا مظہر ٹھہرانا صحیح نظر نہیں آتا۔ اُن کی زندگی مندرجہ بائیبل تو
انسانی اخلاق کاملہ کو ظاہر کرتی نظر نہیں آتی۔ بیں بحیثیت مسلم یہ تو ایمان رکھتا ہوں کہ جناب
مسیح ایک کامل انسان تھے۔ وہ اخلاق ربانی کے مظہر تھے۔ کیونکہ وہ نبی تھے لیکن
انجیل سے وہ ایسے ثابت نہیں ہوتے۔ یہ مان لو کہ اُن کا علم ربانی علم تھا لیکن ربانی
جلال۔ ربانی علم وقدرت والوہیت وجبروت اور بیسیوں امور اس حد تک بھی ان سے
ظاہر ہوتے نظر نہیں آتے، جو بعض تاریخی انسانوں میں پائے جاتے ہیں +

جب خود معلمان مسیحیت اس قسم کے اعلانات کریں، تو اس کا اثر جو پیروان مذہب
پر ہونا چاہئے وہ ظاہر ہے چنانچہ گرجوں اور عیسائی معبدوں کو مغرب میں لوگوں نے
چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ گرجوں کی میزیں اور کرسیاں خالی ہوگئیں۔ سبت منانے والے
اتوار کے دن خدائی گھروں کو چھوڑ کر کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی۔ گولف اور دیگر سیرگاہوں
میں نظر آنے لگے۔ شام کی عبادت میں شامل ہونے والے سینما میں نظر آنے لگے۔ مذہب
سے یہ لاپرواہی اور اس کے اسباب اس قدر نمایاں تھے، کہ **آرچ بشپ
آف یارک** جو انگلستان کے لاٹ پادری ہیں۔ اپنے سرمن (وعظ) میں۔ جو انہوں
نے پچھلے سال دیا۔ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مذہب سے فی نفسہ تو اب بھی لوگوں کو محبت

ہے لیکن کلیسا سے لوگ متنفر ہو گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ دنیا دہریت یا مادیت پر، مذہب کو اب بھی ترجیح دیتی ہے لیکن جس مذہب کو ہم پیش کرتے ہیں، اُس سے دنیا بیزار ہے۔ آپ کے اس فقرے نے اخباری دنیا میں کئی ماہ تک ایک بحث کا سلسلہ چھیڑ دیا لیکن عام طور پر یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ موجودہ بیزاری تعلیم کلیسا ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی ضمن میں اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے کالموں میں یہ بحث شروع ہوئی کہ "فارن مشن" کا آج تک کیا فائدہ ہوا، یہ جو لکھوکھا پونڈ بیرونی دنیا میں پادریوں کے بھیجنے پر خرچ ہوتے ہیں، اس سے کیا فائدہ۔ اور بالخصوص ایسی کتاب کے منوانے پر جس کی صحت پر ہمیں خود شبہ ہے۔" اس کے جواب میں۔ امریکن فارن مشن کے سکرٹری موجودہ لندن کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ "آج تک فارن مشن دوسروں کو عیسائی بنانے میں ناکام رہا" البتہ اُنہوں نے مشن مذکور کی طبی اور تدریسی خدمات ضرور تسلیم کی ہیں

گزشتہ پانچ چھ سال میں۔ جو باتیں ان معلمان مسیحیت نے بیان کیں، جن کا خلاصہ میں اوپر دے چکا ہوں وہ تو سب کی سب مشہورہ عقائد عیسوی کے خلاف تھیں مجھے تو ایک بھی بات مسیحی مذہب کلیسا کی مقبولہ آج نظر نہیں آتی جس سے ۱۹۱۶ء لے کر ۱۹۲۳ء تک انکار نہ ہو گیا ہو، مثلاً مسیح کی **الوہیت**، اُس کی **ابنیت**، مسئلہ **گناہ موروثی** **کفارہ**، انجیل توریت کا **الہامی** ہونا۔ یا ان کے **واقعات مبینہ کا ایک**

صحیح تاریخ کی حیثیت رکھنا پھر **معجزات مسیح** کی اب جو تشریحات کی جاتی ہیں، وہ مقبولہ مسلمہ عقاید عامہ کے خلاف ہیں۔ رپن ہال کالج (مدرسہ الٰہیات) آکسفورڈ کے پرنسپل **ریورینڈ ڈاکٹر میجر** نے تو مسیح کے قبر سے جی اُٹھنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اور کہا ہے، کہ "ان کا موت کے بعد جی اُٹھنا روحانی ہے جسمانی نہیں"۔ اس طرح قبر سے اُٹھنے اور اُس کے بعد کے کل واقعات پر پانی پھیر دیا۔ جس پر عدالت کلیسا میں آکسفورڈ کے **بشپ** کے سامنے پرنسپل مذکور کے خلاف نالش کی گئی۔ لیکن **بشپ** نے ڈاکٹر میجر کو بری الذمہ قرار دیا۔ کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونے کی کہانی کے متعلق پروفیسر **برکٹ پیلس** نے ۲۱۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء کو اپنی تقریر میں کہا۔ کہ "اس کہانی کا پتہ پرانی روایات میں نہیں ملتا، اور یہ قصہ اگر انجیل میں داخل کیا گیا تو اس لئے نہیں، کہ اس سے مسیح کی خدائی منوانا مقصود تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ انسان سمجھا جائے، کیونکہ اُس زمانہ میں ایک یہ عقیدہ بھی تھا، کہ مسیح دراصل روح ہی روح ہے۔ اور اُس میں کوئی انسانی جسم کا حصہ نہیں لہٰذا ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونا اُس کی جسمانیت ثابت کرنے کے لئے تجویز کیا گیا"

ان تمام واقعات نے انگلستان میں ایک کثیر تعداد تو انگلی پیدا کر دی جو گرجے سے الگ ہو گئے، دوسرے وہ جنہیں ان بشپوں اور ڈینیوں کی باتیں سمجھ نہ آتی تھیں اور اُنہیں خلاف عقیدہ سمجھتے تھے، ناچار تنگ ہو کر یکم دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو **آرچ**

بشپ کنٹربری کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا گیا جس پر کلیسائے انگلستان کے مختلف نمایندوں کے دستخط تھے اور اُن میں نو بشپ بھی شامل تھے میموریل میں یہ درخواست کی گئی، کہ ایک کمیشن کے ذریعہ ان اختلافات کی تحقیق ہو، اور کوئی اتفاق کی صورت پیدا کی جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو خطرناک فساد ہوگا آرچ بشپ نے ایسی کمیشن کے تقرر سے انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ اس سے اور خطرات پیدا ہو جائیں گے، ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کیا، کہ علم و سائنس جو کچھ کر رہی ہے اُس کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، آرچ بشپ بھی کرے تو کیا کرے، جب اُس کے ماتحت ایسی کافی تعداد فاضلان مسیحیت کی یہ جدید عقاید رکھتی ہے۔ پھر ان میں وہ لوگ ہیں، جو علم و فضل کے آسمان کے ستارے ہیں۔ مثلاً بشپ۔ ڈین۔ ڈیکن۔ آرچ ڈیکن! الہیات کے کالجوں کے پرنسپل اور پروفیسر۔ تو وہ کیا کرے +

ان معاملات کی اہمیت اور نزاکت آخر یہاں تک پہنچی کہ ابتدائے جون ۱۹۲۳ء میں خود آرچ بشپ مذکور کو کنٹربری میں ایک جلسہ کرنا پڑا جس میں زیادہ وقت اس امر کے غور میں گزارا۔ کہ کس طرح گلے کو منتشر ہونے سے بچایا جائے۔ اور یہ جو کثیر التعداد لوگ اب کلیسا سے باہر ہو گئے ہیں۔ اُن کو کس طرح واپس کیا جائے آرچ بشپ کا خیال تھا۔ کہ عیسائیت کو یہ نقصان فرقہ بندی سے پہنچا ہے۔ جس

کی روک تھام کی جائے۔ اور مختلف فرقوں کو پھر اکٹھا کیا جائے۔ لیکن بقول اخبار ریفارمسٹ مذکورہ بالا انتشار فرقہ بندی سے پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کی تہ میں تشکک اور مادیت پرستی ہے، اور اسی کا فکر ہونا چاہئے لیکن میرے نزدیک اس کے اسباب کچھ اور ہیں جب ۱۹۱۷ء میں یہ بزرگ تسلیم کر چکے ہیں کہ موجودہ کلیسا کا ماخذ جناب مسیح کی تعلیم نہیں تو پھر یہ باتیں کلیسا میں کہاں سے آگئیں۔ مثلاً نسل انسانی کا ایک خطرناک مصیبت میں گرفتار ہونا، جو اُن کے ورثہ میں آدم سے آئی۔ اس مصیبت سے نجات دینے کے لئے خود خدا کا دنیا میں آنا۔ انسانی آمیزش سے بچنے کے لئے کنواری کے رحم کو اپنی قرارگاہ اور مخرج ٹھہرانا۔ نسل انسانی کو مصیبت سے بچانے کے لئے سزا کو اپنے سر لینا۔ شیطان کی خدا سے جنگ۔ خود خدا کا مغلوب و مصلوب ہو کر دشمن انسان (سانپ) کا سر کچلنا۔ کمی عذاب مخلوق کو پورا کرنے کے لئے دو دن دوزخ میں جانا۔ پھر موت پر غالب آکر شیطان پر غلبہ پانا۔ ایمان صلیب کو شرط نجات ٹھہرانا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو کلیسا نے ایمانیات مسیحیت میں داخل کر دی ہیں۔ ان سے مسیح کی تعلیم کو کوئی تعلق نہیں۔ اب فرقوں کا جمع ہو جانا کس طرح ان دقتوں کو رفع کر سکتا ہے۔ آخر اس نئی جماعت کے جو مختلف فرقوں کو ملا کر بنے گی معتقدات کیا ہوں گے، جدید الخیال فضلائے مسیحیت نے تو ان پانچ چھ سالوں میں ان باتوں

سے انکار کر دیا۔ پس سوال یہ ہے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو ان کو قایم رکھا جائے۔ اور اگر یہ غلط ہیں۔ تو عامتہ الناس مسیحیت ان امور کو ہرگز چھوڑ نہیں سکتے جب تک ان کا ماخذ غیر مسیحی سرچشمہ ثابت نہ کیا جائے۔ یہ خیال کرنا کہ یہ محقق فضلاء اس سرچشمہ سے ناواقف ہیں۔ ان کے علم و فضل پر حملہ کرنا ہے، وہ اغلباً اس سرچشمہ سے واقف ہو چکے ہیں مسیح سے قبل کی دنیا جسے مسیحی اصطلاح میں ہیگین ازم (کفر و الحاد) کہتے ہیں، اس قسم کی داستانوں اور عقاید کا گھر تھی۔ یہ امور اب متحقق ہو چکے ہیں اور مغربی فضلائے مسیحیت کی امانت و دیانت ان باتوں کو مسیحی مذہب میں دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن اس راز کے طشت از بام ہونے میں بھی ایک مصیبت کا امکان ہے۔ کیونکہ انگلستان کا مذہبی نظام بھی گورنمنٹ کے نظام سے کچھ کم نہیں۔ صدیوں سے یہ دونوں نظام ایک دوسرے کے لازم ملزوم واقع ہوئے ہیں۔ ایک کی پراگندگی دوسرے کی بنیاد ہلانے کا ان کے نزدیک احتمال رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ صحیح عقاید و حسنِ اعمال ہی دنیا میں کسی سلطنت کی مضبوطی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ امانت و دیانت ہی پالیسی پر غالب آتی ہے۔ الغرض صورت حال یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو قدیمہ عقاید کو یہ بزرگ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت کے نام کو برقرار رکھ کر آہستہ آہستہ اس کی تعلیم کی نوعیت بدلنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد دسمبر ۱۹۲۲ء کے جلسے میں رکھ دی جاتی ہے۔ جب یہ علما

سنہ ۱۹۱۶ء سے چلکر اگست سنہ ۱۹۲۱ء تک کل تعلیم کلیسا سے الگ ہو گئے، اور اس طرح عیسائیت کے مقبولہ۔ مروجہ مفہوم پر خط نسخ پھیر چکے، تو اُن پر یہ لازم آگیا، کہ وہ اپنے مفہوم عیسائیت کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ عمائد مذہب آکسفورڈ میں جمع ہو گئے۔ اور ایک لمبے مباحثے کے بعد یہ قرار دیا کہ مذہب عیسویت دراصل مذہب محبت ہے یعنی یہ مذہب انسان کو خدا اور مخلوق الہیہ سے محبت کی تعلیم کرتا ہے ✦

دراصل مذہب صحیح کا موضوع بھی یہی ہے، لیکن خدا سے محبت، اور انسان سے محبت، اپنی اپنی نوعیت میں ایک دوسرے سے جدا گانہ ہیں، خدا سے محبت کا اظہار انسان سے محبت کے اظہار سے بالکل الگ واقع ہوا ہے، انسان تو محبت کا محتاج ہے لیکن خدا اس سے بے نیاز ہے۔ خدا سے اظہار محبت کا طریق ایک ہی ہے یعنی اس کے احکام کی تعظیم کی جائے۔ اور اس کے شعار کی عزت ہو۔ دوسری طرف مختلف انسانوں کی مختلفہ حیثیت مختلف طریق پر محبت کا اظہار چاہتی ہے۔ باپ۔ بیٹا۔ بیوی۔ ہمسایہ۔ اقارب اہل شہر۔ دشمن۔ دوست۔ ان سب سے محبت کرنا مختلف صورتیں چاہتا ہے، لہذا محبت انسان کی مختلف نوعیات کو سامنے رکھکر اس کے حقیقی مفہوم کے اظہار کے لئے اگر کوئی جامع مانع لفظ ہے تو وہ لفظ **شفقت** ہے۔ خصوصاً جبکہ ہمارے دائرہ محبت میں انسان کے علاوہ دوسری مخلوق بھی آجائے، مذہب حقہ تو یہی ہے جیسا کہ

میں نے بیان کیا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ آنحضرت صلعم سے جب کسی نے اسلام کی تعریف پوچھی تو آپؐ نے اس حقیقت کو نہایت ابلغ و افصح الفاظ میں یوں بیان فرمایا **تعظیم لامر اللہ و شفقت علی خلق اللہ**۔

رہا یہ کہ اس مذہب کا عملی پہلو کن اصولوں اور کن تعلیمات کو چاہتا ہے اُن کا کافی مواد مجھے جناب مسیحؑ کی وصایائے مندرجہ بائیبل میں نظر نہیں آتا۔ اس مضمون پر میں اس کتاب کے آخری حصہ میں کچھ عرض کروں گا۔

اس جلسہ آکسفورڈ میں یہ بھی تسلیم کیا گیا۔ کہ جناب مسیحؑ کے علاوہ اس مذہب محبت کے معلم اور بھی ہیں مثلاً بدھ۔ اُنکا مذہب بھی مذہب محبت ہے، البتہ ان بزرگوں کے نزدیک اسلام اس فہرست میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس بات کا فیصلہ تو انشاءاللہ اس کتاب کے آخری صفحات کرد ینگے لیکن یہ امر اس جلسہ میں مان لیا گیا کہ عیسائی مذہب اس معاملہ میں کوئی خاص خصوصیت نہیں رکھتا۔ بلکہ عیسائی مذہب تو بدھ مذہب کی ایک جھلک ہے۔ اگر تو محبت کے معنی صرف حلم۔ بردباری۔ اور ناممکن التعمیل عفو۔ موذی انسانوں کی رسی دراز کرنے کے مواقع پیدا کرنا۔ دفع ضرر کے اسباب سے تمسک نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ تو پھر بدھ کی تعلیم تو بہت ارفع ہے اُس کا ایک خفیف سا چربہ جناب مسیحؑ کی تعلیم ہے۔ جناب بدھ کا حلم۔ جناب مسیحؑ کے حلم سے بہت

بڑھا ہوا ہے، پھر بدھ کی زندگی میں۔ تو اُس کے وصایا عملی جامہ پہنے ہوئے نظر
آتے ہیں۔ مگر یہ بات مسیحؑ کی مختصر سی زندگی میں نظر نہیں آتی مسیحؑ کے حالات آپ
کی تعلیم آپ کی بعض تمثیلیں بدھ کی باتوں سے کچھ ایسی ملتی جلتی ہیں۔ کہ اگر مسیحی پند و
نصائح کا ماخذ بدھ کی تعلیم ٹھہرا دی جائے۔ تو یہ قرین قیاس ہے۔ چنانچہ جب مسیحی
مناد پہلے پہلے چین گئے۔ اور وہاں تعلیم بدھ میں اُنہیں بہت سی انجیلی حکایات
و روایات نظر آئیں۔ تو بعض پادریوں نے ایک نئے انکشاف کا اعلان کیا۔
انہوں نے کہا، کہ بدھ والوں نے انجیل سے بہت کچھ سرقہ کیا ہے لیکن بعد میں
اُن کی گھبراہٹ کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ جب اُنہیں یہ معلوم ہوا کہ مسیحؑ سے پانچسو برس
پہلے جناب بدھ دنیا میں یہ تعلیم لائے تھے۔ مجھے یہاں بدھ مذہب پر کچھ لکھنا منظور
نہیں لیکن اگر محبت کا پہلا مستحق کوئی انسان ہے تو اس کی مستحق صنف لطیف ہے
جس کی طرف جناب بدھ کی بہت ہی کم توجہ ہوئی ہے۔ نروان کی تلاش میں بال
بچوں کو دوسروں کے رحم پر چھوڑ دینا، پھر نروان حاصل کر کے بھی بیوی بچوں کی طرف
ملتفت نہ ہونا۔ یہ عمل کچھ اس قسم کا مذہب پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے
دائرہ محبت میں معاشرت خانگی بہت کم نظر آتی ہے۔ حالانکہ انسانی محبت کا آغاز
اہل و عیال کے حلقہ میں ہی شروع ہوتا ہے جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، باجو

متاہل نہیں ہوتے۔ وہ کسی دوسرے سے پوری محبت نہیں کر سکتے۔ گھر کی زندگی ہی منبع محبت ہے، خدا کی شان جن دو مذاہب کو یہ معلمان مسیحیت مذہب محبت کہتے ہیں اُن میں سے ایک کے بانی نے تو عورت سے شادی ہی نہیں کی، اور دوسرے نے شادی تو کی، مگر تعلقات زناشوئی کو غیر ضروری سمجھکر قایم نہ رکھا۔ اس موضوع پر انشاء اللہ میں آیندہ چلکر مفصل لکھوں گا۔

واقعات مذکورہ بالا جو ۱۹۱۵ء سے چلکر آج تک انگلستانی کلیسا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اُنسے عیسوی کلیسا اور اُس کے عقاید، جن کی بنیاد **پولوس** اور دوسرے قدیمی رہوان نے ڈالی تھی، وہ آج مٹ گئے۔ یہ میں ہی نہیں کہتا۔ بلکہ اسی ستمبر کے گزشتہ ہفتہ میں جو چرچ کانگرس ہوئی ہے۔ اُس میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ "آج کلیسا اور اُس کے عقاید ایک بے عمل چیز ہیں۔ اس کا کوئی اثر غور وفکر کرنے والے لوگوں پر نہیں رہا، اس کی باتیں قابل جواب نہیں سمجھی جاتیں، جنگ سے پہلے تو لوگ ایک عادت کے طور پر گرجوں میں آجاتے تھے، لیکن اب وہ بات ہی نہیں رہی"۔ کانگرس میں جس مضمون پر جو بحث ہوئی، اُس میں ہر مقرر نے قریب قریب یہ ضرور کہا، کہ آج کلیسا کیا کر رہا ہے۔ یہ تو شہروں کا حال ہے، دیہاتیوں میں جہاں کے لوگ عموماً مذہب سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں وہاں بھی یہی رونا ہے پادری **سمپسن** نے تقریر کرتے ہوئے کہا، کہ جہاں گرجے ہیں ہیں

آتے تھے آج پانچ نہیں رہے"۔ پادری ہم نے نوجوان مرد عورتوں کی اخلاقی حالت
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، کہ اُن کی اصلاح کے لئے کیا کیا جائے۔ انہیں بائبل
کا کیا حوالہ دیں، جبکہ خود فضلاء مسیحیت کے نزدیک اس کی صحت مخدوش ہے۔ آج بیسویں
صدی کی روشنی میں اُن باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے جو عیسائیت کے تاریک زمانہ میں تجویز
کی گئیں" فاعتبروا یا اولی الابصار۔ باتیں وہی دنیا میں قایم رہتی ہیں جو خدا کی ہوتی ہیں
انسان کا بنایا ہوا مذہب بیت عنکبوت ہی ہوتا ہے۔ آج گیارہ سال ہوئے جب ستمبر
کے آخری ہفتہ میں میں انگلستان پہنچا۔ میں نے عیسائی کلیسا کو پوری رونق میں دیکھا۔ آج
ستمبر کے آخری ہفتے میں ہی یہ کانگرس ہوتی ہے، جو عیسوی مذہب کی کل مقبولہ باتوں
کو چھوڑ دیتی ہے۔ اور مذہب کو نیا لباس دینا چاہتی ہے، بالفاظ دیگر پرانا مذہب
ختم اور نئے مذہب کی تلاش ہے۔ مسلمانو غور کرو اس وقت مغربی دنیا میں کیا نہیں
ہوسکتا۔

اساطیر الاولین

مسیحی کلیسا کے ماخذ

انگلستانی کلیسا کے ممتاز فضلا نے تو یہ قرار دے دیا جیسے کہ پہلے صفحات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کلیسا مذکورہ کی کل کی کل تعلیمات نہ صرف قابل تسلیم ہی نہیں، بلکہ انہیں جناب مسیح سے کچھ تعلق بھی نہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ مسیحی دنیا ان فضلا کے فیصلہ جات کی پابند نہیں۔ اگرچہ مشرق کے عیسائیوں نے تعلیم و ہدایت کے لئے ہمیشہ مغرب کے آگے سر جھکایا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں، کہ یہ مغربی فیصلے بھی تسلیم کر لئے جائیں۔ چنانچہ جب ڈاکٹر **رشڈل** (ڈین کارلائل) نے الوہیت مسیح کی یہ نئی تشریح کی، کہ جناب مسیح نہ روحاً۔ نہ جسماً۔ نہ عقلاً۔ نہ علماً۔ نہ اپنے ارادے کے برتنے میں خدا تھے، بلکہ وہ ہر معنوں میں انسان تھے۔ البتہ متخلق باخلاق اللہ تھے یعنی اُن کے اخلاق ربانی اخلاق تھے۔ اور اسی قدر ان میں الوہیت تھی اور ہمارے نزدیک جیسے کہ اوپر بیان ہوا۔ وہ ایک کامل انسان تھے۔ اور ایسے ہزاروں انسان گزرے ہیں اگرچہ انجیل تو انہیں

اتنا بھی ظاہر نہیں کرتی۔ لیکن ایک مسلم اُن کے متعلق ایسا ہی ایمان رکھنے پر مجبور ہے۔
مگر عیسائیوں نے عام طور پر نہ صرف ڈین مذکور کی اس تشریح کو ہی قبول نہ کیا۔ بلکہ
ڈین موصوف کو عیسائیت ہی سے خارج قرار دیا۔ سیلون۔ ہندوستان۔ برما
ملایا سے یہی آوازیں آئیں کہ یہ تشریح جناب مسیحؑ کو جامہ الوہیت سے معرا کر دیتی ہے
اور بات بھی سچ ہے لیکن سوال یہ ہے، کہ جن باتوں نے مسیحؑ کو خدا بنا رکھا ہے
اگر وہ خود ہی پایہ ثبوت سے گری ہوئی ہوں تو ڈین موصوف اور اُس کے ہمنواؤں
کا کیا قصور ہے۔ باتیں تو صرف تین چار ہی ہیں جن کی بنیاد پر مسیح کو خدا بنایا گیا
ہے یعنی مسیحؑ کا بن باپ پیدا ہونا۔ اُن کا مصلوب ہونا۔ موت پر غالب آکر زندہ
ہونا۔ اُن کا آسمان پر چڑھ جانا۔ ان امور کو فضلا تو ہرگز صحیح تسلیم نہیں کرتے لیکن
اگر ان باتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی مسیح خدا نہیں ٹھہرتے۔ کیونکہ اُن سے
پہلے درجن بھر انسانوں کی داستانیں ان امور کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ خدا
کی صفات وہی ہوتی ہیں جو بے شل و بیچگوں ہوں اور اگر مسیحؑ سے پہلے کی دنیا
بھی ایسی ہستیوں کی مثال سے خالی نہ ہو جن میں یہی باتیں پائی جاتی ہوں،
تو پھر یہ باتیں انسانی صفات میں آشامل ہونگی۔ ان سے الوہیت ثابت نہ ہوگی
خواہ ایسے وجودوں کی تعداد دس بارہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ مشکل یہ آن پڑی ہے

کہ یہ کہانیاں اُن مذاہب کی ہیں جن کا نام مسیحی دنیا نے پیگن ازم رکھا ہے۔ اب اگر یہ کل کے کل واقعات لفظاً اور معناً، حتیٰ کہ ان واقعات کی تفصیل تک پیگن ازم کی روایات میں موجود ہوں۔ اور تاریخوں تک بھی ملجائیں، وہی دن ہوں، وہی سمیات ہوں، رسموں کے منانے کی بھی طرز وہی ہو، اور انجیلی عیسائی روایات و مسلمات میں اور پورانی داستانوں میں صرف نام و مقام کا ہی فرق ہو، اور باقی کل کی کل باتیں ایک ہی ہوں، تو پھر یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ضرورت وقت اور عیسائی مذہب کو ہر دل عزیز بنانے کے خیال نے قدیمی راہبوں کو اس بات پر مجبور کر دیا، کہ وہ قدیمی مذاہب کفر و الحاد کی روایات کو جناب مسیح اور اُن کی والدہ پر جوں کی توں چسپاں کر کے لوگوں کو یہ کہدیں کہ جناب مسیح ہیں اُن کے قدیمی خداؤں نے ظہور کیا، اور اس طرح اُس وقت کے غیر مسیحی لوگوں کو یہ یقین دلادیں، کہ یہ کوئی نیا مذہب نہیں، یہ اُن کا ہی قدیمی مذہب ہے۔ اُن کا ہی خدا ایک دوسری شکل میں آتا ہے چنانچہ اُس کے کل کے کل حالات بھی وہی ہیں بس سے یہ بات ماننی پڑے گی کہ مسیح سے پہلے کی ہستیاں بھی مسیح کیطرح دنیا میں آئیں اور مسیح کا ہی کام کر کے چلی گئیں۔ مگر اس صورت میں یہ دقت پیدا ہوتی ہے۔ کہ اگر مسیحی مذہب صداقت و راستی ہے تو انہی واقعات پر قدیمی مذاہب کو کفر و الحاد کیوں کہا جاتا ہے۔ اور اگر انہیں صحیح طور پر پیگن ازم

کہا گیا ہے تو مسیحی مذہب کو کیا کیا جائے گا۔ کاش بعض واقعات ملتے جلتے ہوتے تو بھی
کوئی گنجایش تھی۔ یہ تو کل کی کل وہی باتیں ہیں۔ **دوسری بات** یہ ہے۔ کہ مسیح
جیسے انسان پہلے ہو چکے ہیں۔ اور اُن کے مذاہب بھی ظہور مسیح پر دنیا میں موجود تھے
تو پھر آپ کی ضرورت کیا تھی جس کا نام عہد جدید رکھا جاتا ہے۔ وہ تو عہد عتیق سے
بھی عتیق ہے۔ بات وہی پہلی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مورخ گبن کی بھی یہی رائے ہے
یعنی عیسوی مذہب کو ہر دل عزیز بنانے کے لئے قدیمی راہبوں نے جناب مسیح کو ایک
طرف تو **متھرا بعل۔ اشارٹی ہیکیس۔ ایڈونس۔ اطیس۔ آپالو**
ہورس۔ اوسیرس۔ کوئیٹزل کوٹل کا قائم مقام بنایا دوسری طرف **ڈیمیٹر۔**
آئی سس۔ ہرنھا۔ نانا جنو۔ چیلمن سملی۔ ڈائنا۔ فرگا۔ نیتھ کی قائم مقام
جناب مریم ٹھہرائی گئیں۔ کیونکہ یہ سب کی سب بیویاں اپنے اپنے ہاں **عذرا** اور
کنواریاں ہی مانی گئی ہیں۔ یہ سب کی سب بحالت بکر ہی مذکورہ بالا خداؤں کی مائیں
بنیں۔ پھر سب سے حیرتناک بات یہ ہے، کہ ان سب کی پیدایش ۲۵ سے لیکر ۲۸ دسمبر
تک ہی واقع ہوئی ہیں۔ اور نہ صرف تاریخ ہی ایک ہے۔ بلکہ بقول **مارٹر جسٹن** مسیح
اور اُن کی ولادت گاہیں بھی یکسانیت سے خالی نہیں جس کی تفصیل آگے چلکر کرونگا۔
میں یہاں عیسائی دوستوں کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ وہ میری باتونکو

ٹھنڈے دل سے سنیں۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ سچے دل سے اپنے معتقدات پر قایم ہیں۔ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ جو کچھ بھی وہ مان رہے ہیں اُس میں وہ خدا اور مسیحؑ کی خوشنودی سمجھتے ہیں لیکن میں اُن کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، کہ اگر یہ امر ثابت ہو جائے، کہ جس کفر و الحاد کو مٹانے کے لئے جناب مسیحؑ دنیا میں آئے، اگر وہی باتیں اُن کی تعلیم میں پھر آ شامل ہوئیں۔ تو پھر کیا اُن کا اور ہمارا فرض اولین نہیں کہ جناب مسیحؑ کے مذہب حقہ کو ان باتوں سے پاک کردیں؟ میں یہ نہیں کہتا، کہ وہ جناب عیسیٰؑ کو چھوڑ دیں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ اپنے گروہ کو چھوڑ کر ہر رنگ میں میرے ہم مشرب ہو جائیں۔ آخر ان پانچ چھ سالوں میں کیا اُن بزرگوں نے جو فلک کلیسا کے درخشندہ تارے ہیں۔ ان سب باتوں کو خود ترک نہیں کر دیا؟ پھر بھی وہ جناب مسیحؑ کے نام لیوا ہی ہیں عیسائی ہی کہلاتے ہیں عیسوی مذہب ہی کے خادم اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ انگلستانی کلیسا کے معزز سے معزز عہدوں پر اب تک متمکن ہیں، لکھوکھا انسان ان کے زیر اثر ہیں۔ کوئی **بشپ** ہے کوئی **ڈین** ہے کوئی **ڈیکن** ہے۔ کوئی **آرچ ڈیکن** ہے۔ پھر ان کے علاوہ صدہا گرجوں کے **پاسٹر** ہیں۔ کلیسا کے سب سے بڑے دو ہی عہدہ دار ہیں۔ ایک **آرچ بشپ آف یارک**۔ دوسرے **آرچ بشپ آف کنٹربری**۔ اول الذکر نے

تو علی الاعلان کہدیا ہے کہ کلیسا اس وقت نفرت انگیز ہے۔ جب **آرچ بشپ آف کنٹربری** کی خدمت میں ان باتوں سے گھبراکر پرانے خیال کے عیسائی عرض کرتے ہیں کہ آپ کچھ فیصلہ کریں تو وہ پہلوتہی کرتے ہیں۔ خود انہوں نے بھی گزشتہ جون میں اپنے ہاں جلسہ کرکے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ لوگ ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں، گرجے خالی ہوگئے۔ لوگ سبت کو لہو و لعب کے ذریعہ مناتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ بات ظاہر ہے محققین تو اس نتیجہ پر آچکے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ کلیسا میں ہو رہا ہے۔ پُرانی **آفتاب پرستی** ہے۔ البتہ وہ ان باتوں کو عام طور پر ظاہر نہیں کرتے۔ انہوں نے اسی اعلان پر اکتفا کیا ہے کہ عیسائی کلیسا جناب مسیح کا بنا کردہ نہیں۔ عامۃ الناس کو کلیسہ کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ معاملہ نے طول یہانتک کھینچا کہ ایک دن ایک دوست نے میرے سامنے سگرٹ کی ڈبیہ کھولی۔ تاجران سگرٹ اپنے نمونوں کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ڈبیہ میں کوئی نہ کوئی عام دلچسپی کی چیز ڈال دیتے ہیں۔ اکثر تو ان ڈبیوں میں خوبصورت تصویریں رکھدیتے ہیں لیکن ایک مشہور فرم اپنی ڈبیہ میں جو کارڈ ڈالتی ہے تصویر کی بجائے اُس میں کوئی نہ کوئی علمی بات لکھی ہوتی ہے۔ یہ ایسٹر کے دن تھے جس وقت یہ ڈبیہ کھولی گئی۔ تو اس میں سے جو کارڈ نکلا اُس پر **ایسٹر** کی تاریخ تھی۔ آج عیسائی دنیا میں یہ دن بڑی عزت اور خوشی سے منایا جاتا ہے

یہی وہ دن ہے جو مسیح کے موت پر غالب آنے کا دن سمجھا گیا ہے۔ یہی وہ دن ہے جو مسیحی اعتقاد کے بموجب **نئی زندگی۔ نئے عہد۔ نئے آدم** کے آنے کا دن ہے۔ بالمقابل یہی وہ دن ہے اور یہی وہ تاریخ ہے۔ اور آفتاب کی ایک نئی کیفیت کا یہی پہلا دن ہے (جس کی تشریح میں آگے چلکر کروں گا) جس وقت زمین مردہ حالت سے نکلکر نئی زندگی اختیار کرتی ہے۔ اس کو اگر ایرانیوں نے **نوروز** کر کے منایا ہے تو ہندؤوں نے اسے **بسنت** کا دن ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح مصر اور آئرلینڈ کے لوگ **ایسٹر** کے دن بہار کی دیوی کی پرستش کرتے تھے جس کا نام **آسٹر** تھا۔ لفظ ایسٹر آسٹر سے ہی نکلا ہے! ایسٹر کے معنی **بہار** ہیں۔ پھر اس لفظ کا تعلق مشرق (یعنی سورج کے نکلنے کی جگہ) سے ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ نئے عہد یا موت پر غالب آکر نئی زندگی کے حصول کا دن تمثیلاً روحانی دنیا میں بھی وہی تجویز ہو جیسا جسمانی دنیا میں زمین زمستانی قبر سے نکلکر اپنے اندر نئی زندگی پاتی ہے۔ اور اس طرح کل عالم کے لئے نئی زندگی لاتی ہے لہذا مسیح خدا نے ایک ڈرامے کے طور پر عالم روحانیات کے متعلق وہی کر دکھایا جو سورج زمین پر کرتا ہے، لیکن مشکل ایک اور آن پڑتی ہے جس کی طرف سگریٹ کی ڈبیہ کا کارڈ اشارہ کرتا ہے۔ **ایسٹر** کے دن عیسائی احباب آپس میں کچھ تحفہ تحائف بھیجتے ہیں۔ اُن تحفوں میں علی العموم **انڈے** اور کراس **کیک** یعنی ایسی روٹی جس کے

صلیب کا نشان ہوتا ہے) ہوتے ہیں۔اس کی وجہ بھی ظاہر ہے عیسوی کلیسا کی تعلیم
کا خلاصہ ہی صلیب ہے یہی **نئے عہد یا نئی زندگی کا نشان** ہے لیکن
کارڈ مذکور میں یہ لکھا تھا کہ **ایسٹر کی تقریب دراصل بہار کی دیوی کی تقریب ہے** اُس دن ہی انڈے اور کراس کیک مصر اور آئرلینڈ والے آپس میں
تقسیم کیا کرتے تھے۔ صلیبی کیک کی تشریح تو صلیبی واقعہ سے ہو بھی جاتی ہے لیکن
ان انڈوں کی کلیسا کیا تشریح کرے گا۔ کارڈ مذکور نے جو تشریح کی ہے وہ مغربی
محققین کی تحقیق سے ہی اخذ کی گئی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ایسٹر کی رسم صرف عیسائیوں
سے ہی تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ آفتاب پرستوں نے اُسے ہر جگہ ہمیشہ منایا ہے آفتاب
کی ایک خاص کیفیت زمین پر بہار کو لاتی ہے۔ بہار اگر زندگی ہے تو خزاں موت
ہے۔ اس موت اور زندگی سے انسانی موت وحیات وابستہ ہے۔ انسانی
زندگی کا حصر روٹی پر ہے۔ جو زمین ہی کی پیداوار ہے۔ زمین کی شکل انڈے کی
واقع ہوئی ہے۔ اس لئے قدیم شامیوں نے صلیب نا روٹی اور انڈے کو مردہ
زمین اور نئی زندگی کا نشان ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ تو پایا گیا۔ کہ انڈے اور
روٹی اور صلیب اور انکا تعلق مسیحی ایسٹر کے دن سے ہونا کوئی نئی بات نہیں۔
یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ رہا یہ امر کہ قدیم سے صلیب کا تعلق ایسٹر یا آفتاب سے

کیا ہے؟ اسے میں آگے چلکر بیان کروں گا لیکن یہاں میں عیسائی دوستوں کے غور کے لئے ایک بات عرض کرتا ہوں۔ وہ سوچیں کہ یہ صلیب کا نشان کب کلیسا میں آیا سکندریہ کے راہب **کلیمنٹ** نے جو کتاب عیسائی مذہبی نشانوں پر لکھی ہے، اُس میں **صلیب** نہیں دی گئی۔ اُس میں مسیح کا نشان **مچھلی** ہے چنانچہ زمانہ قسطنطین تک عیسائی قبروں پر صلیب کی جگہ مچھلی کی تصویر ہوتی تھی۔ عبادتگاہوں میں بھی صلیب کی جگہ مچھلی کی شکل ہی نظر آتی تھی۔ راہب **ٹرٹولین** مسیح کو "ہماری ماہی اعظم" کے نام سے پکارتا ہے سینٹ **آگسٹس** سینٹ **جیروم** بھی اس طرح مسیح کو یاد کرتے ہیں مسیح کی خوراک بھی مچھلی ہی نظر آتی ہے۔ دراصل اس کو بھی ایک شمسی کیفیت سے تعلق ہے، جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ ہاں مسیح سے پہلے شماسی دنیا میں ہر جگہ صلیب بطور نشانِ زندگی نظر آتی تھی۔ آج آئرلینڈ کے کھنڈرات میں ایک صلیب نکلی ہے، اُس پر ایک شخص پھانسی پر چڑھا ہوا نظر آتا ہے، اُس کی شکل کے وہ خط و خال نہیں جو یورپین تصور نے مسیح کی تصویریں دکھلائے ہیں لیکن اُس صلیب پر چڑھے ہوئے انسان میں ایک اور امر بھی ہے، جو اُسے مسیح سے متمیز کرتا ہے اُس کے سر پر **کانٹوں کا تاج** نہیں۔ بلکہ ایرانی تاج ہے اور آفتاب پرستی کو جو ایران سے تعلق ہے وہ ظاہر ہے مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے آفتاب پرستی ایران سے

چلکر آئرلینڈ پہنچی تھی ۔ یہ باتیں اب مان لی گئی ہیں ۔ پھر سب سے بڑھکر ایک طرف تو یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ یہ آئرلینڈ کے کھنڈرات دو ہزار برس سے پہلے کے ہیں ۔ دوسری طرف چوتھی صدی تک کلیسا کے لٹریچر اور آثار میں صلیب بطور نشان مذہب نظر نہیں آتی ۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ نشان صلیب شاہ قسطنطین کی اختراع ہے ۔ جو بقول اُس کے اُس نے عالم خواب میں آسمان پر دیکھی ہیں آگے چلکر یہ دکھاؤں گا کہ صلیب کو آفتاب کی اُس خاص کیفیت سے کیا تعلق ہے ، جسکے باعث ظہور موسم بہار اُس تاریخ کو ہوتا ہے جس کے بعد دن بڑھتا ہے لیکن یہ بات ہم بھول نہیں سکتے کہ شاہ قسطنطین سورج پرست تھا ۔ اہل روما یعنی اُس کی قوم سب آفتاب پرست تھی ۔ اُس وقت سورج دیوتا کا نام روما میں **اپالو** تھا ۔ شاہ مذکور کا مربی دیوتا بھی **اپالو** ہی تھا ۔ شمس پرستی سے شاہ مذکور کو اس قدر وابستگی تھی کہ اُس کے سکے کے ایک طرف تو سورج کی شکل تھی ، اور اُس کے دوسری طرف ذیل کی عبارت ثبت تھی :-

Des Soli Invicto Mithra میں اسے اپنے نہ مغلوب ہونے والے رفیق سورج کے نام پر معنون کرتا ہوں +

اگر تو یہ سکہ اُس کے ایام شمس پرستی تک رہتا تو چنداں مضایقہ نہ تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہ سکہ اُس کے مرتے دم تک رہا عبارت بالا کے الفاظ سے ظاہر ہے ، کہ

قسطنطین کا دل آخری وقت تک مسیحؑ سے نہیں، بلکہ اپالو اور منتھرا یعنی آفتاب سے استمداد کرتا تھا۔ اُس نے اگر خواب میں اپنے معبود (آفتاب) کو آسمان پر مصلوب ہوتے دیکھا، تو وہ معبود تو ہر سال گڈ فرائیڈے یعنی روز الیسٹر سے دو دن پہلے صلیب پر ہوتا ہے۔ جسے منجم خوب جانتے ہیں۔ اور وہی معبود اس صلیب سے الیسٹر کے دن اُتر کر دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ آج مصر کے کھنڈرات میں مسیحؑ سے صدیوں پہلے کی ایک صلیب نکل آئی ہے جو اپنے وقت کی معبود تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ صلیب بھی نئی زندگی کا نشان ہی مانی جاتی تھی۔ یہ وہمی باتیں نہیں، جس کی خوشی ہو۔ بیری طرح سکندریہ کے عجائب خانہ میں جاکر اُس کی زیارت کر آتے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ وہ صلیب نئی زندگی کا نشان تھی یا نہیں +

شاہ قسطنطین کسی نیک یا مذہبی غرض سے عیسائی نہیں ہوا تھا۔ خود عیسائی محققین نے یہ تسلیم کر لیا ہے، کہ اس کی تبدیلیٔ مذہب خالصتہً پولیٹیکل اغراض سے تھی۔ وہ ایک مطلق العنان طبیعت کا انسان تھا۔ اُس کا استبدادی رنگ رومن جمہوریت کے سامنے چل نہیں سکتا تھا، وہ اپنے چچازاد بھائی کو قتل کر چکا تھا، جس کے قصاص کا خطرہ اپنے معاصرین کی طرف سے اُسے آٹھوں پہر رہتا تھا، رومن لوگ اُس وقت دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ جو رومن جمہوریت میں

اُس کے ہم پلہ تھے یعنی امرا اور اعلےٰ طبقے کے لوگ جو آفتاب پرست تھے۔ دوسرے اُن کے غلام اور خدام وغیرہ جو سب کے سب قریب قریب عیسائی تھے، جو کئی نسلوں سے غلامانہ زندگی بسر کرنے کرتے جی حضوری طبیعت کے ہو چکے تھے۔ اور جن میں استبدادی رنگ آسانی سے چل سکتا تھا۔ مذہب عیسائیت کے اختیار کرنے سے ایک بھاری جماعت تو اُس کے قابو میں آسکتی تھی لیکن شاہی اور قومی مذہب کو بدلنا اور اُس کی جگہ ایک اور مذہب قایم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ خود اُسے اپالو سے اس قدر محبت تھی۔ اُس کا آسان سے آسان رستہ یہی تھا کہ وہ سورج کے مذہب کو تو ہر رنگ میں قایم رکھے لیکن صرف نام بدل دے اور اپالو کی کرسی پر جناب مسیح کو بٹھا دے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اس طرح ایک طرف اہل روما نے اپنے مذہب میں کچھ ایسی تبدیلی نہ پائی۔ دوسری طرف عیسائی نام پر ہی خوش ہو گئے۔ وہ بیچارے ادنےٰ سے ادنےٰ حیثیت کے لوگ تھے۔ علم دین سے بھی ناواقف تھے۔ مذہب تو وہی رہا صرف معبود کا نام اپالو کی بجگہ مسیح ہو گیا۔ آخر اپالو بھی تو ہرکیولیز اور ڈایونیسس اور متھرا کا ایسا ہی قایم مقام تھا۔ یہ بات تو مدت سے یونان و روما میں چلی آتی تھی، روایات مذہبی تو قدیمی قایم رہتی تھیں ہیرو کا نام بدل جاتا تھا +

لہذا پالو کا جو مندر تھا اُس میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ آج اگر اُس کا نقشہ دیکھنا ہو تو رومن کیتھلک کیتھیڈرل کو دیکھ لیا جائے وہی وضع عمارت۔ وہی شکل و صورت اور سب سے بڑھکر آلٹر یعنی مذبح کا وہی گوشہ مشرق میں ہوتا ہے آج دنیا کا کونسا گرجا ہے جو خواہ کسی فرقہ عیسائیت سے تعلق رکھتا ہو، مشرق میں ہو یا مغرب میں جس کی آلٹر گوشہ مشرق میں نہیں۔ یروشلیم سے مغرب کے لوگ اگر آلٹر کا رخ گوشہ مشرق کی طرف کر دیتے تو ہرج نہ تھا لیکن یروشلیم۔ یا بیت اللحم۔ یا ناصرہ کے مشرق میں رہنے والے عیسائی کیوں آلٹر کو مشرقی گوشہ میں رکھتے تھے پہلی چند عیسائی صدیوں میں جس قدر گرجے بنتے تھے اُس میں صرف اسی قدر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ہیکل مغرب بمشرق رویہ ہو لیکن مذبح کو بلا تمیز جہت جہاں کہیں بھی ہو بنا دیا جاتا تھا بلکہ[^۵۱] پلاٹینس نولانس اپنی کتاب میں ایک گرجے کا ذکر کرتا ہے جس میں مذبح مغرب کی طرف تھا۔ ایسا ہی انطاقیہ کے گرجے بھی اسی وضع کے ہوتے تھے (انطاقیہ وہ مقام ہے جہاں ایک عرصہ بعد پیروان مسیحؑ نے پہلی دفعہ عیسائی نام اپنے لئے تجویز کیا) یہ ایک اتفاقی بات نہیں، بلکہ مشرق کو اُس زمانہ کے عیسائیوں نے ایک خاص اہمیت دے رکھی تھی۔ چنانچہ سینٹ جیروم فرماتے ہیں کہ "ہمارے

[^۵۱]: کتاب "اوور سن گاڈ" مصنفہ جے پارسنز صفحہ ۱۶۹ سنہ ۱۹۰۰ء

سرائڑیں یہ بھی ہے، کہ ہم پہلے اُس سے کنارہ کشی کرتے ہیں جو مغرب میں ہے، پھر مشرق کا رُخ کرتے ہیں"۔ اسی طرح **سینٹ امبروس** کے الفاظ میں ذیل کا فقرہ بھی ہے "جب تم بپتسمہ پانے کی جگہ میں داخل ہوتے ہو، اور اپنے دشمن کو دیکھتے ہو، جس سے کنارہ کرکے مشرق کے رُخ پھرتے ہو، کیونکہ جو شیطان کو چھوڑتا، وہی مسیح کی طرف آتا ہے"۔ یروشلم کا راہب **سرل** اسی ضمن میں کہتا ہے "بمقام بپتسمہ میں داخل ہونے پر تمہیں مغرب رو کھڑا کیا جاتا ہے، جہاں تم شیطان کو ترک کرتے ہو، مغرب ظلمت کی جگہ ہے، گویا مغرب کی طرف رخ کرنا، شیطان کی طرف رخ کرکے اُسے چھوڑنا ہے"۔ یہ امر صحیح ہے، کہ اگر مسیح کو آفتاب صداقت کہا جائے تو مغرب مشرق کے الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوسکتے ہیں، مگر یہ توجیہ اُسی وقت صحیح ہو سکتی ہے۔ جبکہ شمس پرستی کی اور باتیں کلیسی مذہب میں نہ ہوں لیکن اگر کل کی کل کلیسیا کی بنیاد ہی آفتاب پرستی پر ہو، اس کی روایات بھی وہی ہوں، تو پھر ہم اس نتیجہ پر مجبوراً آتے ہیں، کہ یہ امر بھی شمس پرستی سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

دوسری طرف جو بات ان شناس طبیعت مسیحیوں نے مسیحی روایات کے خلاف لیکن شماسی روایات کی اتباع میں کی وہ سبت کے دن کی تبدیلی تھی مسیح کے سبت کا دن ہفتے کا دن تھا۔ اُس کے حواری ہفتے کے دن ہی سبت مناتے تھے۔

اور عیسائی دنیا مدتوں اس کی پابند رہی۔ اُس کے مقابل اپالو ہی کا نہیں، ہر جگہ سورج کی پرستش کا دن اتوار تھا، اگر ہندی میں ایت سورج کو کہتے ہیں، تو یورپین زبانوں میں سنڈے جس کے معنی بھی سورج کا دن ہے۔ اور اہل روما اسے Solis Dies mensis دینی سورج دیوتا کا دن کہتے تھے۔ عیسائی دوست خود غور کرلیں کہ یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ اگر عیسائیوں کے لئے مسیحؑ کے قول و فعل ہی واجب الاتباع ہونے چاہئیں تو پھر کسی کو حق پہنچتا ہے، خواہ وہ پولوس ہو یا قسطنطین، جو عبادت کے دن کو بدلے۔ رہا یہ کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا دن اتوار ہے۔ اس لئے اتوار تجویز کیا گیا، اول تو حواریوں نے اور ان کی اتباع میں مدتوں اوروں نے سبت ہفتے کے دن منایا۔ دوسری طرف مسیحؑ کا قبر سے نکلنا بھی دنیا میں کوئی پہلا ہی واقعہ نہیں۔ بلکہ جیسے میں آگے چلکر بیان کروں گا، مسیحؑ سے پہلے مذہب آفتاب پرستی میں کئی ایسے وجود گزرے ہیں، وہ سب کے سب معبود، اور اپنی اپنی جگہ کے سورج دیوتا تھے۔ وہ سارے کے سارے مسیحؑ کی صلیب کے دن صلیب پر کھینچے گئے، یا صلیب سے ملتی جلتی موت کے ساتھ مارے گئے، ان کے مصلوب یا مقتول جسم قبر میں رکھے گئے، اُن میں سے بعض مسیحؑ کی طرح دو دن دوزخ میں گئے، اور ایسٹر کی ہی اتوار کو قبروں سے اُٹھے، اس لئے یہ توجیہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، یہ تو اُسی آفتاب پرستی کی رسم کو قایم رکھا گیا ہے۔ چاہئے تو

یہ تھا، کہ مسیحی دین کو ہر رنگ میں آفتاب پرستی سے الگ کر لیا جاتا خصوصاً جبکہ مسیح کی چوتھی صدی تک کل کی کل دنیا شمس پرست تھی۔ قربان جاؤں حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے، اُس نے اسلامی نمازوں کو اس شائبہ سے الگ کر دیا، اور حکم دیا کہ سورج کے طلوع، زوال، اور غروب کے وقت کوئی نماز، فرض ہو یا نفل، نہ پڑھی جائے ÷

گرجے کے مذبح (آلٹر) کا گوشہ مشرق میں ہونا، یا اتوار کے دن سبت کا منایا جانا، ان دونوں باتوں کو بھی چھوڑ دو، رومن کیتھلک گرجوں میں کم عمر بچوں کا گیت گانے کے لئے رکھا جانا، وہی اپالو کے مندر کا نقشہ ہے۔ ان کے علاوہ منک (راہب) اور نن (تارکہ) بھی وہی اپالو کے مندر کی صورتیں ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں تو نہ راہب نظر آتے ہیں، نہ تارکیں، چنانچہ اسی بنا پر کیتھلک فرقہ کے سوا باقی سب فرقوں نے انہیں چھوڑ دیا۔ لیکن اس امر کے متعلق میں ایک فیصلہ کن بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کسی راہب یا تارکہ کی چاند آج بھی دیکھ لیں، یقیناً آفتاب پرستی کی یاد دلائے گی۔ تارکوں کے سر پر اگر بال نہیں، تو اسے زاہدانہ ترک زینت سمجھ لیا جائے، لیکن راہبوں کی چاند میں اور ایسا ہی ہر کیتھلک پادری کی چاند میں بھی ایک گول ٹکیہ ہوتی ہے، جس پر سے بال منڈے ہوتے ہیں، یہ گول ٹکیہ

قرصِ آفتاب کی شکل ہوتی ہے، یہ ٹکیہ کہاں سے پیدا ہوئی، اس کو مسیح کی کونسی تعلیم
سے تعلق ہے؟ اس کا کوئی صحیح جواب نہیں لیکن جب اس ٹکیہ کو بھی ہم اپالو کے
راہبوں کے سر پر پاتے ہیں، تو پھر رومن کیتھلک کے اس سارے کے سارے
رنگ کو آفتاب پرستی نہ کہیں تو کیا کہیں۔ اس موقع پر ایک پروٹسٹنٹ کہہ سکتا ہے
کہ ہمیں کیتھلک عیسائیوں کی ان باتوں سے تعلق نہیں لیکن اُسے یہ امر بھولنا نہ
چاہئے کہ یورپ میں جب عیسائی مذہب پھیلا تو کیتھلک شکل میں ہی پھیلا۔ یہ مانا
کہ دوسرے فرقوں نے کچھ عرصہ بعد یہ باتیں چھوڑ دیں لیکن اتوار کا دن اور آلٹر
تو آج تک وہی ہے، اور اُس کے علاوہ باقی کل کی کل روایات اور معتقدات
بھی وہی ہیں۔ چنانچہ اس امر کو اور روشن کرنے کے لئے میں صلیب کے واقع کو لیتا
ہوں، اور سردست **بابل** کی ایک تاریخ کا ورق قارئین کی دلچسپی کے لئے لکھ دیتا
ہوں۔ باقی سورج دیوتاؤں کا ذکر اپنے اپنے موقع پر آئے گا ✦

بابل کے کھنڈرات تو آئے دن دنیا کو حیران کر رہے ہیں لیکن ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء
میں شہر **کالاشیرکٹ** کے کھنڈرات سے کچھ سلیں برآمد ہوئی ہیں، جن پر حروف
کندہ ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں قدیمی شہر اسور واقع تھا۔ یہ سلیں کتبخانہ اسور
میں سے ہیں، جو مسیحؑ سے نو سو برس پہلے قایم ہوا تھا۔ لیکن یہ کتبے، ان سے بھی بہت

قدیمی بابلی کتبات کی نقل ہیں۔ ان کتبات کے مضامین نے مغربی دنیا کو حیران کر دیا یہ توصیح ہے کہ مسیح کے لئے دشمنوں نے صلیب تجویز کی آخر وہ تو میں اس کی راوی ہیں لیکن جو داستان صلیب بائیبل پیش کرتی ہے ان کتبات سے مشتبہ ہو جاتی ہے +

میں یہاں ان کتبات کی عبارات متعلقہ کو درج کر دیتا ہوں، اور اُس کے مقابل انجیلی داستان کے واقعات درج کر دیتا ہوں۔ البتہ اس موضوع پر مسٹر میڈ کا مفصل اور دلچسپ آرٹیکل جو رسالہ کویسٹ لنڈن کے جنوری نمبر ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے

بابل کی داستان صلیب	انجیل کی داستان صلیب
(۱) بعل گرفتار ہوتا ہے	(۱) مسیح گرفتار ہوتا ہے
(۲) بعل کا مقدمہ پہاڑی والے گھر (کمرہ عدالت) میں ہوتا ہے	(۲) مسیح کا مقدمہ بڑے ربی کے گھر میں اور پھر پیلاطوس کی عدالت میں ہوتا ہے
(۳) بعل کو مارتے ہیں اور زخمی کرتے ہیں	(۳) مسیح کو کوڑے لگائے جاتے ہیں
(۴) بعل کے ساتھ دو مجرم ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو سزائے موت دی جاتی ہے اور ایک مجرم کو چھوڑ دیا جاتا ہے اُسکو بعل کے ساتھ (سزا کیلئے) نہیں لیجاتے	(۴) مسیح کے ساتھ تین مجرم تھے جن میں سے دو کو سزائے موت دی گئی اور ایک مجرم بارابس نام چھوڑ دیا گیا، اور وہ مسیح کے ساتھ نہ گیا

(۵) بعل کو پہاڑی کی طرف (مارنے کے لئے) لے گئے	(۵) مسیح کو صلیب دینے کیلئے گول گوتھا (پہاڑی ٹیلہ) پر لیگئے [سلہ]
(۶) بعل کے پہاڑی کی طرف جانے پر شہر میں شور و فساد شروع ہوگیا اور لڑائی ہوئی	(۶) مسیح کی موت کے بعد ہیکل کا پردہ پھٹ گیا، زلزلہ آیا، چٹانیں پھٹ گئیں، قبریں شق ہوگئیں، وغیرہ وغیرہ
(۷) بعل کے کپڑے لے لئے گئے	(۷) مسیح کا لباس سپاہیوں میں تقسیم ہوا
(۸) بعل کے جسم میں ایک آلہ کے چبھونے سے جو خون اُسکے دل سے نکلا، اُس کو ایک عورت نے پونچھا	(۸) مسیح کے پہلو میں (دل کے قریب) بھالا کا لگنا خون پانی کا نکلنا پھر عورتوں کا جسم دھوکر مشک عطر لگانا۔
(۹) بعل پہاڑی کی تہ میں چلا جاتا ہے، جہاں سورج اور روشنی نہیں، وہ زندگی سے غائب ہوجاتا ہے	(۹) مسیح چٹانی قبر میں ڈالا جاتا ہے، اور وہاں سے وہ عالم اموات میں چلا جاتا ہے
(۱۰) بعل کو پہاڑی قلعے میں بند کرکے اُس پر پہرہ رکھا گیا	(۱۰) مسیح کی قبر پر پہرہ رکھا گیا
(۱۱) ایک دیوی بعل کے پاس بیٹھتی ہے	(۱۱) مریم مگدلینی اور دوسری مریم قبر کے سامنے بیٹھتی ہیں
(۱۲) بعل کو جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں اُسکی تلاش کرتے ہیں خاصکر ایک عورت روتی ہوئی قبرستان کے دروازے پر اُسکی تلاش کرتی ہے، اور روتے ہوئے کہتی ہے کہ میرے بھائی! اے میرے بھائی!	(۱۲) مریم مگدلینی، قبر پر مسیح کی تلاش میں آتی ہے، قبر کو خالی دیکھ کر روتے ہوئے کہتی ہے، کہ میرے خداوند کو لے گئے۔
(۱۳) بعل پھر زندہ ہوتا ہے، اور پہاڑ سے نکلتا ہے	(۱۳) مسیح زندہ ہوکر قبر سے نکلتا ہے

سلہ اس ٹیلے کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ منہ

(۱۴۳) اس واقعہ کی تقریب پر بابل میں مارچ کے آخری ایام میں دھوم دھام سے جلسہ ہوتا ہے، خصوصاً اس امر کے لئے کہ اُس دن بعل ظلماتی طاقت پر غالب آیا

(۱۴۴) عیسوی دنیا میں انہی دنوں ایام ایسٹر میں جو خوشی کا تہوار منایا جاتا ہے، اُس کا بھی مقصد یہی ہے، کہ مسیح اُس دن ظلمانی طاقت پر غالب آیا

اب ایک محقق اگر انجیلی داستان کے واقعات کو بہت حد تک بابلی داستان سے لیا ہوا نہ سمجھے، تو کیا کہے۔ بیس سال سے یہ بابلی کہانی روشنی میں آچکی ہے، فضلائے مسیحیت اسے دیکھ اور سُن چکے ہیں، اس پر کوئی مخالف تنقید نہیں کی گئی۔ بالفرض اگر یہ دو واقعات اصلیت میں متشابہ ہوتے، تو تاریخ تو بعض واقعات دُہرایا ہی کرتی ہے لیکن یہاں تو تاریخ وہی ہے، قریب قریب کہانی وہی ہے، فرق ہے تو نام اور مقام کا۔ پھر موت، اور موت سے جی اُٹھنے کی غرض ایک ہی ہے یعنی ظلماتی طاقتیں خدا کے نور پر غالب آنا چاہتی ہیں، اور کچھ وقت کے لئے اُس پر غالب بھی آجاتی ہیں، حتّٰی کہ وہ مٹ جاتا ہے، اور مٹنے کے بعد پھر ظلماتی طاقتوں پر غالب آجاتا ہے۔

یہ امر محقق ہو چکا ہے، کہ بابل کے لوگ آفتاب پرست تھے، اور بعل اُس قوم کا سورج دیوتا تھا۔ وہ لوگ ایام بہار میں ٹھیک اُس دن، جب دن رات برابر ہو کر دن بڑھنے لگتا ہے، یہ رسم ادا کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ تھیٹر کے رنگ میں ہوتا تھا، بخت نصر کے ایام حکومت میں بھی یہ تھیٹر ہوا کرتے تھے، جو یہودیوں کو قید کر

بابل میں لے گیا تھا، جہاں اسرائیلی اسیر کئی نسل تک غلامانہ حیثیت میں رہے، ان بھیڑوں کو دیکھتے رہے، اور وہ ایسی پران قصوں کو ساتھ لائے۔ اس واقعہ کے علاوہ توریت اور اسرائیلی شعار میں جو بیبیوں اور بانیں بھی آفتاب پرستی کی شامل ہوگئی ہیں، مغربی تحقیق نے اُن سب کو اسی واقعہ بخت نصر اور قید اسرائیل کی طرف منسوب کیا ہے۔ کتاب پیدایش کے واقعات وغیرہ سب کے سب بابل سے نکل آئے۔

اب عیسائی دوستو از روئے انصاف آپ خود ہی بتلاؤ، کہ ہم انجیلی واقع پر کیا رائے زنی کریں۔ کاش بابل کے اس سورج دیوتا کے قدیمی مذہب کفر و الحاد دیگین ازم) میں بھی ایک کہانی ہوتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ظہور مسیحؑ کے وقت، ایران۔ بابل۔ نینوا۔ کارتھیج۔ سیریا۔ یونان۔ روما۔ مصر۔ دیگر یورپین ممالک خصوصًا آئرلینڈ، اور سمندروں پار میکسیکو سب جگہ آفتاب پرستی ہوتی تھی۔ ہندوستان بھی اس سے خالی نہ تھا۔ ان سب ممالک میں اپنے اپنے ہاں ایک نہ ایک سورج دیوتا تھا۔ ان کے نام جیسے میں پہلے لکھ چکا ہوں حسب ذیل تھے۔ **متھرا** (ایران) **بعل** (بابل) **اطیس** (فریجیا، سیریا) **استارتی** (کارتھیج۔ سیریا) **ایڈونس** (سیریا) **بیکس** (یونان روما) **ہرکیولیس** (یونان و روم) **ہورس** (مصر) **اوسیرس** (مصر) **کیٹزل کوٹل** (میکسیکو) **اپالو** (روما) پھر یہ کہ ان میں سے اکثر باکرہ کے ہی پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں،

تاریخ ولادت بھی ان میں سے اکثر کی وہی ۲۵ سے لیکر ۲۸ دسمبر تک کی ہے جسے سورج کی ایک خاص کیفیت سے تعلق ہے (جسکو میں آگے چلکر بیان کرونگا) پھر سب سے بڑھکر[۱] نسل انسانی کو مصیبت اور گناہ کی سزا سے بچانے کیلئے خدا یا خدا کے بیٹے کا انسانی شکل اختیار کرنا اور اپنی قربانی سے نسل انسانی کو نجات دینا ایک عام عقیدہ مسیح سے پہلے ہر جگہ موجود تھا خصوصًا ان مذاہب میں جسے آج عیسائی پیگنزم (Paganism) کہتے ہیں اطیس درخت سے بندھا ہوا اور اس کے جسم میں میخیں چبھی نظر آتی ہیں درخت کے نیچے ایک بچھڑا دکھایا جاتا ہے (ڈبو میں صفحہ ۲۵۵) اڈونس کی موت کے مختلف بیان دیئے گئے ہیں لیکن ایک مجسمہ میں وہ بطور مصلوب نجات دہندہ دکھلایا گیا ہے اسکی موت کی یاد میں جو دن منایا جاتا تھا۔ اس میں ایک مجسمہ کو کفن میں لٹاکر روتے پیٹتے تھے۔ اور وہی باتیں کرتے تھے، جو آج رومن کیتھلک گڈ فرائیڈے کے دن کرتے ہیں۔ پرومیتھیس نسل انسانی کے لئے کوہ قاف کے دامن میں پہاڑ سے باندھا جاتا ہے، ناراض شدہ خدا کے کارکن اسکے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونکتے ہیں۔ وہاں وہ صلیب کی طرح ہاتھ پھیلائے نظر آتا ہے۔ اور کہتا ہے "اسکی مرضی کے خلاف مجھے کوئی نہیں بچا سکتا" (اسکائیلس ہیکس) ابن جیوپیٹر (خدا) بھی انسانوں کی نجات کیلئے مقتول ہوتا ہے۔ بسلر میرینیر کے مقرا بن اللہ کے معبد کے کھنڈرات میں ایک صلیب پائی گئی ہے۔ اسیریس قتل ہوتا ہے اور اسکے اعضاء و جوارح الگ کئے جاتے ہیں فی الجملہ دیوتاؤں کا نسل انسانی کیلئے مصلوب ہونا اور صلیب کا نشان نجات ٹھہرا۔ مسیح کے وقت اور اسکے بعد دو تین صدیوں تک ایسا عام تھا کہ راہب مینوسیس فلپ اپنی کتاب اوکٹومیس میں پگین لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ ہم لوگ تو صلیب کے پرستار نہیں ہیں یہ تو تم اسکی پرستش کرتے ہو، تمہارے علموں، جھنڈوں، اور ہر ایک بات پر صلیب کا نشان ہے" خود ڈرٹولین نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے) وہ اپولوجیا میں پگین کو مخاطب کرکے لکھتا ہے کہ تمہارے سب کے سب خدا تو وہی تصویریں ہیں، جو صلیبوں پر نظر آتی ہیں۔ تمہارے سب علموں پر صلیبیں یا مصلوبوں کی شکلیں ہیں کرشن کو ٹل کی تصویریں بھی مصلوب ہی نظر آتی ہیں، اور وہ موت نسل انسانی کے گناہ کے کفارہ میں مانی جاتی ہے (کنگزبارو صفحہ ۱۶۰ و ۱۶۷)

اس بات کو ہم کیا کریں، کہ ان میں سے بعض کی موت بھی مسیحؑ کی موت سے ملتی جلتی ہے
اُن سب کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے، کہ وہ نسل انسانی کی نجات کے لیے مرے، وہ سب کے
سب اپنے پرستاروں میں نسل انسانی کے **نجات دہندہ** اور **شفیع** کہلائے مسیحؑ
کی طرح نسل انسانی کی تعلیم کے لئے اکثر سفر میں رہے، (خود لفظ مسیحؑ کے ایک معنی بہت سفر
کرنے والا بھی ہیں) اُن کی ولادت بھی غار یا کسی تہ خانہ میں ہوئی، اُن پر ظلماتی قوتیں
غالب آئیں، وہ مرے، دوزخ یا تحت الثراء میں اُترے، مردوں میں سے جی اُٹھے،
وہ اپنی جماعت میں مریدوں کو بپتسمہ کے ذریعہ داخل کرتے تھے، اُن میں سے بعض
کے شاگرد بھی بارہ ہی تھے، اُن کی یاد میں ایک قسم کی عشاء ربانی بھی ہوتی تھی،
ان مشابہتوں کے علاوہ، بہت سے کیتھلک تہوار، اور اُن تہواروں کی تاریخیں بھی
وہی ہیں، جو ان قدیمی مذاہب میں پہلے سے موجود تھیں۔ مثلاً جناب مریمؑ کے طہر کی
تاریخ، اور اُس میں موسمی پھولوں کا آنا، معراج مریم، مریم کی پیدایش کی تاریخ اب یہاں
میں چند سورج دیوتاؤں کا ذکر کر دیتا ہوں +

متھرا ایک غار میں ۲۵ دسمبر کو کنواری کے پیٹ سے پیدا ہوا، اُس کے
بارہ شاگرد تھے، وہ انسانوں کی تعلیم کے لئے جگہ بہ جگہ جاتا تھا، قبر میں دفن ہوا،
اور قبر سے نکلا، اُس کے جی اُٹھنے پر خوشیاں منائی گئیں، اُس کی یاد میں دو تہوار

منائے جاتے تھے، ایک شروع جنوری سے آٹھ دن پہلے، اور دوسرا اخیر مارچ (وہی کرسمس اور ایسٹر ہیں)، اُس کے پیرو ضیافت **عشائے ربانی** میں بھی شریک ہوتے تھے، اُسے **منجی** اور **شفیع** کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور **بعض وقت اُس کی شکل بچھڑے کی بنائی جاتی تھی**۔ یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ ساری کی ساری باتیں، حتیٰ کہ بچھڑہ کی شکل بھی، سورج کی مختلف کیفیات سے تعلق رکھتی ہیں یہ بھی یاد رہے، کہ تیسری چوتھی صدی عیسوی میں **متھرا** ہی کی پرستش سب جگہ غالب آگئی تھی۔ روم کا **اپالو** بھی **متھرا** کا ہی اُتار یا قایم مقام تھا، آئرلینڈ کے کھنڈرات میں جو صلیب پر چڑھے ہوئے کے سر پر ایرانی تاج نکلا ہے، وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ **متھرا** کے نام پر سورج پرستی ایران سے ہی نکلی (ملاحظہ ہو **پیگن کرائسٹس** صفحہ ۳۳ مصنفہ رابرٹسن۔ ڈرمٹا گاگ مصنفہ نارک مطبوعہ لپزگ پیگن اینڈ کرسچین کریڈیس صفحہ ۱۲ مصنفہ اڈورڈ کارپنٹر) **اسیرس**۔ ۲۷۔ دسمبر کو باکرہ **نیفتھ** کے پیٹ سے مصر میں پیدا ہوا جس کی پیدائش پر ایک (آسمانی) آواز نے اعلان کیا، کہ یہ سب کا خداوند ہے، مسیح کے متعلق بھی اسی قسم کی آواز کا ذکر انجیل میں ہے، اُس نے تلوار کے ذریعہ نہیں بلکہ محبت اور ملائمت سے، (مسیح کی طرح) لوگوں کی اصلاح کی، غلہ اور شراب اُسی کی ایجاد کردہ ہیں مسیح کا پہلا معجزہ بھی شراب ہی بنانا ہے۔ اُسے ٹائفن نے دہوکہ

اسقریوطی کی طرح) پکڑوایا، وہ قتل ہوا، اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے،
اُس کی نعش کو صندوق میں رکھا گیا، اور موت سے دو دن کے بعد پھر زندہ ہوا،
جس طرح چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں مسیح کی تکالیف۔ اُن کی موت اور جی اُٹھنے
کو ناٹک کے رنگ میں ہر برس دکھلایا جاتا تھا۔ اسی طرح شہر ابیڈوس میں بھی اسی
قسم کے ناٹک ہر سال ہوتے تھے۔ مصر کا دوسرا سورج دیوتا ہورس نام آئی سس
باکرہ کے پیٹ سے ۲۸۔ دسمبر کو پیدا ہوا (کتاب آئی سس اسیرس مصنفہ پلوٹارک) اُس کی
اور روایات کو چھوڑ کر میں ایک خاص واقع کا ذکر کرتا ہوں جس نے مسیحی دنیا میں عظیم
الشان اہمیت حاصل کی ہوئی ہے۔ یہ جو تصویروں میں، اور کیتھلک گرجوں میں عام طور
پر مریم عزرا کی گود میں ایک آسمانی بچہ (مسیح) نظر آتا ہے یہ کہاں سے عیسائی مذہب
میں داخل ہوا پہلی تین چار صدیوں میں تو یہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی بنیاد سکندریہ
کے کلیسا نے غالباً پانچویں صدی میں قایم کی تھی، جہاں صدیوں پہلے شماسی مندروں
میں کنواری آئیسس آسمانی بچے ہورس کو لئے ہوئے پوجی جاتی تھی۔ اس کے مندر
کل مصر میں تھے۔ قدیمی راہبوں نے عیسائی مذہب کو شماسی دنیا میں ہر دل عزیز
بنانے کے لئے جہاں سورج دیوتا کی اور روایات مسیح کے متعلق قبول کر لیں، وہاں
یہ بھی ضروری سمجھا، کہ باکرہ آئیسس اور ہورس کے مندر کے مقابل باکرہ مریم

اور بچہ (مسیحؑ) کے مندر بھی قایم ہوں۔ پھر مندروں کے بنانے تک ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ سورج پرستوں کو یہ یقین دلانے کے لئے، کہ یہ نیا مذہب دراصل انہیں کا مذہب ہے اور مریم اور مسیح وہی **آئیسس** اور **ہورس** ہیں عیسائی آئیسس کے مندر میں جاتے، اُس زمانہ کے عام مسیحی چھوٹے بشپوں تک اسی طرح **آئی سس** اور **ہورس** کے آگے سر نیاز جھکاتے، جیسے مریم اور مسیح کے آگے وہ جھکتے تھے۔ اس طریق عمل نے یہانتک اثر کیا، کہ عام طور پر **آئی سس** اور **ہورس** پرست بھی مریم کے مندر میں جانے لگے، جس طرح کہ عیسائی **آئی سس** کے مندر میں جاتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کے باپ شہنشاہ **ہیڈرین** نے ایک چٹھی میں جو اُس نے **سرویناس** کو لکھی۔ اہل سکندریہ کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کا فقرہ لکھا ہے "جو لوگ پرستارانِ **سیراپیس** (سورج دیوتا) ہیں وہ عیسائیوں کی طرح ہیں۔ بالمقابل جو مسیح کے بشپ کہلاتے ہیں، وہ **سیراپیس** کے پرستار ہیں"۔ پیرس میں جو **نوٹر ڈام** کا بڑا گرجا ہے اُس کے متعلق **ایڈورڈ کارپینٹر** اپنی جدید تصنیف پیگن اینڈ کرسچن کریڈ کے صفحہ ۳۳ میں لکھتے ہیں کہ "یہ گرجا دراصل **آئی سس** کا ہی مندر سمجھا جاتا ہے"۔

ہورس کو لئے ہوئے **آئی سس** کا بت، اور اس کے مقابل مریم اور اُس کی گود میں مسیح کا بت، ابتدائی سنگ تراشوں نے ایک ہی وضع پر تراشا ہے،

میں نے سکندریہ کے عجائب خانہ میں ان دونوں کو دیکھا ہے۔ مصر کے پرانے کھنڈرات نے اس مضمون پر اور بھی روشنی ڈالی ہے **ڈنڈیرا** کے مندر کے گنبد کے اندر کی طرف چھت پر ایک نقشہ بارہ برجوں کا دیا گیا ہے، جہاں **برج سنبلہ** کی تصویر حسب معمول ایک عورت کی دی گئی ہے۔ لیکن اُس کے کنارے پر سنبلہ کے مقابل ایک اور تصویر ہورس کو لئے ہوئے **آئی سس** کی ہے، یہ تصویر مریم اور اُس کی گود میں مسیح کی تصویر کی سی ہے۔ نقشہ برج میں، سنبلہ کے ساتھ ہی ایک کنواری اور بچے کو دکھلانا، کتب نجوم میں یہاں تک دائرو سائر تھا۔ کہ **ابن ذر** عربی منجم، اور **ابو ذر** فارسی منجم نے، جو کروی نقشے بروج کے دیئے ہیں، وہاں بھی **سنبلہ** کے مقابل ایک کنواری بچہ لئے کھڑی دکھائی ہے۔ اب مریم کی گود میں مسیح کا بت سب سے پہلے سکندریہ میں بنایا جانا، جہاں **آئی سس** اور ہورس کا بت پہلے ہی موجود تھا۔ اُس وقت کے اہل مصر کا شمس پرست ہونا نجومی نقشوں میں **سنبلہ** کے ساتھ کنواری کا بچے کو گود میں لئے کھڑی ہونا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ظاہر ہے **ایڈونس**۔ ایڈونس سیریا کا دیوتا بھی کنواری کے بطن سے پیدا ہوا۔ وہ بھی **ٹائفن** کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ کنواریں اُس کے لئے بھی روتی ہیں، جیسے کہ کتاب حزقیل باب ۸ آیت ۱۴ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی

موسم بہار میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے **اطیس** دیوتا کی کہانی بھی اس قسم کی ہے۔ وہ بھی باکرہ بی بی **ناتا** کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، چنار کے درخت کے ساتھ باندھکر وہ قتل کیا جاتا ہے، پھر زندہ ہوتا ہے، اُس کے خون سے ہی دنیا میں سرسبزی ہوتی ہے، **ہرکلیس** یونان اور روم کا سورج دیوتا بھی اسی طریق پر آسمانی باپ کے حمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے بارہ دوست تو نہیں ہوتے، البتہ اُس کے بارہ بڑے کام ہیں۔ اُن میں سے دوزخ میں جانا، موت پر غالب آنا، اور پھر دوزخ سے نکلکر آسمان کی طرف چڑھ جانا، بڑے کام ہیں۔ کیا یہ تینوں باتیں آج ہم جناب مسیحؑ کے متعلق نہیں سنتے +

یہ سورج دیوتا قریب قریب اُنہی ممالک کے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہوئے ہیں۔ اور یقیناً ایران سے چلکر **بابل**۔ کا ریجیج۔ **سیریا**، پھر سیریا سے چلکر ایک طرف **یونان** اور یونان سے روما اور وہاں سے **آئرلینڈ** اور دوسری طرف سیریا سے **یہودہ** اور **فلسطین** اور فلسطین سے **مصر** غرض سب جگہ یہ مذہب پہنچگیا ہے، اسی لئے تو **منتھرا پرستی** کو ہم ہر جگہ غالب پاتے ہیں، آئرلینڈ کے برآمدہ مصلوب معبود کے سر پر ایرانی تاج ہے، لیکن جس امر نے یورپین محققین کو حیران کر رکھا ہے، وہ یہ ہے، کہ **میکسیکو** اور **گواٹی مالا** وغیرہ کا مذہب

بھی وہی روایات اور وہی عقاید اپنے اندر لئے ہوئے ہے جو ہر جگہ پگین ازم میں موجود ہیں، سب سے پہلا پادری دکوٹش، جو میکسیکو میں پہنچا، اُس نے اپنا ہی مذہب ہو بہو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ اور اپنی حیرت کو اُس نے اُسی تشریح کے ذریعہ دور کیا، جو ناوس سے چند صدیاں پہلے جسٹن شہید اور دیگر راہبوں کے خیال میں آیئں۔ جب انھوں نے اپنے ہی مذہب کی روایات و حکایات کو متھراستی میں موجود پایا۔ ان سب داستانوں میں متھرا کی طرح میکسیکو کے خدا کوئٹزل کوٹل کی داستان داستان مسیح سے بہت ہی جلتی جلتی ہے میکسیکو میں ایک عفیفہ باکرہ چملمن نام تھی۔ اُسے بھی فرشتے نے ہی اطلاع دی، کہ وہ بکر ہی میں بچہ کی ماں ہوگی۔ چنانچہ اس آسمانی اطلاع کے بعد ہی وہ حاملہ ہوگئی۔ ایام مقررہ کے بعد بچہ پیدا ہوا جس کا نام کوئٹزل کوٹل رکھا گیا جس کے معنی ہیں ہمارا پیارا بیٹا۔ اُس نے بھی چالیس دن روزہ رکھا وہ بھی آزمایش میں پڑا، وہ بھی مارا گیا، وہ بھی پھر جی اُٹھا۔ اُس کی بھی آمد ثانی کا انتظار کیا گیا۔ حتیٰ کہ جب پادری کوٹش وہاں پہنچا، تو اُن سادہ لوحوں نے پادری صاحب کو سرخ و سفید پا کر سمجھا کہ ہمارا خدا دکوئٹزل کوٹل ہی واپس آگیا ہے۔ پھر مریم کی طرح، چملمن کو بھی، دوشیزہ ملکہ جنت کہتے تھے۔ آج اگر جناب مریم کو عیسائی دنیا اَور لیڈی (یعنی ہماری خاتون) کہتے ہیں تو کنواری اَلی رسن

کو بھی مصری لوگ آوَرلیڈی (یعنی ہماری خاتون) ہی کہتے تھے (اور سیکلپن انٹی کوئیٹیز جلد ۲ صفحہ ۷۶ مصنفہ کنگز یارون)

بیکس یا ڈایونائسس کا بھی یہی قصہ ہے، وہ بھی اسی تاریخ کو کنواری سیملی کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ بھی نسل انسانی کو نجات دینے کیلئے ہی مرتا ہے۔ الغرض ان سب داستانوں میں تاریخ ولادت، ولادتگاہ، کنواری کا حمل، نسل انسانی کی نجات کے لئے ان کا مرنا، موت کا صلیب پر، یا درخت کے ساتھ بندھکر، یا خون کے نکالے جانے، یا قتل کے ذریعہ واقعہ ہونا، مرکر اکثر حالتوں میں دو دن کے بعد جی اُٹھنا، ان دونوں میں دوزخ یا تحت الثریٰ یا عالم اموات میں جانا، ان کے جی اُٹھنے کے دن کا روز عید بننا، ان سب کا شفیع، نجات دہندہ۔ روشنیٔ عالم۔ پہلوٹھا بیٹا۔ اکلوتا وغیرہ وغیرہ کے نام سے موسوم ہونا۔ ہر جگہ ایک ہی دوسری طرف انجیل میں ہی یہی باتیں ہم دیکھتے ہیں۔

یہ باتیں بالضرور آج مٹ گئی ہیں، گو کتابیں، اور کھنڈرات اور پُرانے کتبے، ان کی تصدیق میں موجود ہیں۔ جو یورپین محققین کے نزدیک مسلم ہیں، لیکن اگر کوئی زبردستی شک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے کیونکہ جب مسیحیت نے یورپ میں طاقت پائی تو ان آثار قدیمیہ کو تلوار کے ذریعے مٹا دیا گیا، ان مذاہب کے معلمین کو قتل کیا گیا، ہائی پیشیا

ے دیکھو صفحہ ۱۰۳

کے خون کیلئے جو اسکندریہ میں مذہب شناسی کی ایک زبردست فاضل معلمہ تھی، آج بھی تاریخ کے اوراق اسکندریہ کے بشپ کو متہم کر رہے ہیں۔ جس نے ایک پادری کے ہاتھ سے اس فاضلہ کو ۴۱۵ء میں قتل کرایا۔ اسی بشپ سے پہلے سکندریہ کے بشپ نے ۳۹۱ء میں پُرانے مذاہب کا فلسفہ اور علوم مٹانے کے لئے، **شہنشاہ تھی اوڈوسیس** سے اجازت لیکر، سکندریہ کا کتبخانہ جلا دیا۔ جس کا الزام تیرھویں صدی میں بشپ **ابوالفراجیس** کے ذریعے حضرت خلیفہ ثانی کے ذمہ لگایا گیا[1]۔ الغرض یہ آثار تو آج مٹ گئے لیکن چھٹی ساتویں صدی تک یہ باتیں عیسائی مذہب کے دوش بدوش موجود تھیں۔ جو کچھ عیسائی مذہب میں ہو رہا تھا، اور وہ وہی ہے جو آج ہے، وہی اُس وقت سورج پرستوں میں موجود تھا۔ اور یہ دو تین صدی سے چلا آ رہا تھا۔ جن راہبوں نے ان باتوں کو عیسائی مذہب میں داخل کیا تھا، وہ بھی عرصہ سے مر چکے تھے۔ اسلئے مذہب شناسی اور مذہب عیسائی کا یہ تقابل اور تشابہ لوگوں کی حیرت کا موجب ہوا۔ اس وقت کے متشککین کے اطمینان کے لئے ضروری تھا، کہ وقت کا کلیسا ان باتوں کی تشریح کرے۔ تاریخ کلیسا میں **جسٹن شہید، سینٹ اگسٹس، سینٹ جیروم، سینٹ ٹرٹولین**، بڑے پایہ کے راہب مانے گئے ہیں اُن کی تحریروں میں

[1] حالانکہ تیرھویں صدی عیسوی کے پہلے کی ایک تاریخ بھی اس قابل نفرت افترا وبہتان سے متعفن نہیں۔ ا ر ق گنجوی

ہم ذیل کی باتیں پاتے ہیں **سینٹ ٹرٹولین** لکھتے ہیں، "شیطان کا تو کام ہی صداقت کو روکنا ہے، چنانچہ عشاء ربانی کی ہو بہو نقل وہ اپنے بتوں کے متعلق کراتا ہے، وہ اپنے پیروؤں کو بپتسمہ بھی دیتا ہے، اُن سے وعدہ کرتا ہے، کہ مقدس حوض (جس کے پانی سے بپتسمہ دیا جاتا ہے) سے ہی اُنہیں گناہ کی معافی ملے گی، بپتسمہ کے ذریعہ وہ اُنہیں مذہب **متھرا** میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اُن کی پیشانی پر نشان کرتا ہے، روٹی کی تقدیس بھی کرتا ہے، دوبارہ جی اُٹھنے کا بھی ایک نشان قایم کرتا ہے، یعنی اپنے پرستاروں کو پانی سے بپتسمہ دے کر اُنہیں گناہوں سے پاک کرتا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے کہ اُس کے بڑے پادری تو ایک شادی کریں، لیکن اُس کے ہاں کنواریاں بھی ہیں اور راہب بھی ہیں"۔ **جسٹن مارٹر فرماتے ہیں** رسولوں نے جو تفسیریں لکھیں، جنہیں ہم انجیل کہتے ہیں، اور وہ ہم تک پہنچی ہیں، اُن میں مسیح رسولوں کو حکم دیتا ہے۔ "پھر اُس نے (مسیح نے) روٹی لی، اور خدا کا شکر کیا، اور کہا کہ اس بات کو میری یاد میں کرتے رہنا، یہ میرا جسم ہے۔ پھر اُس نے پیالہ لیا، اور شکر ادا کیا، اور کہا، کہ یہ میرا خون ہے، اور پیالہ اُن کو دیا" یہ ساری باتیں خبیث روحوں نے **متھرا** کے پرستاروں کو سکھلا دی ہیں، اور **متھرا** کی یاد میں اور اُس کی پرستش میں ہو رہی ہیں"۔ پھر مسیح کی پیدایش کا جو طویلے میں ہوئی، حوالہ دیتے ہوئے یہی راہب لکھتا ہے، کہ "بیشک

مسیح کی پیدائش اسی دن ہوئی ہے، جس دن **طوبلہ او جین** میں سورج پیدا ہوا،
بلکہ مسیح کی پیدائش جو طویلہ میں ہوئی، تو یہ دراصل **متھرا** کی پیدائش کا نمونہ ہے، جو زرتشتی
غار میں ہوئی"۔ **سینٹ اگسٹس** کسی قدر فخر کے ساتھ فرماتے ہیں، "کہ ہم کرسمس کے
دن کو کفار کی طرح نہیں مناتے، جو اُن کے ہاں کی پیدائش کا دن ہے، بلکہ ہم تو اس
دن کو اس لئے مناتے ہیں، کہ اُس دن سورج کا پیدا کرنے والا پیدا ہوا"۔

ان راہبوں کی یہ باتیں واقعی بزرگانہ ہیں۔ اپنے وقت کی ضرورت کو وہ
خوب سمجھتے تھے، ہمیں اس سے غرض نہیں، کہ شیطان کس طرح پہلے ہی سے ارادہ
خداوندی سے واقف ہو گیا، اور اُس نے صدیوں پہلے سورج پرستی کی روایات
اور عقاید میں وہی باتیں داخل کر دیں، جو نہ مسیح نے، نہ اُس کے بعد تین صدیوں
میں، بلکہ چوتھی صدی میں جب مسیحیت اور شمس پرستی کا تصادم ہوا، عیسائی مذہب
میں آ داخل ہوئیں، بہر حال یہ امر تو فیصل ہو گیا، کہ سورج پرستی میں بپتسمہ کے ذریعہ
ہی لوگ داخل ہوتے تھے۔ اُن کے مندروں میں بھی مقدس حوض ہوتا تھا، جس کے
پانی سے پیشانی پر بپتسمہ دیا جاتا تھا، بپتسمہ گناہ سے پاک ہونے کا نشان تھا۔ ان کے
ہاں بھی متھرا کی یاد میں عشاء ربانی کی رسم ہوتی تھی، روٹی کی تقدیس ہوتی تھی مسیح کی
پیدائش کی تاریخ نہ صرف **متھرا** یا سورج کی پیدائش کا ہی دن ہے، بلکہ آپکی ولادت گاہ

یعنی طویلہ بھی کسی پرانے طویلے کی یادہے"۔

یہ باتیں تو مقدس راہبوں کی مقبولہ ہیں۔ یہ تو صحیح ہے، کہ مسیح کسی نہ کسی تاریخ کو پیدا ہوا ہوگا، لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے، کہ وہ ۲۵۔ دسمبر کو پیدا ہوا **کینن فیرر** نے اپنی کتاب **حیاتِ مسیح** میں اس امر کو تسلیم کیا ہے، کہ مسیح کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ انجیل میں کہیں اس امر کا ذکر نہیں۔ صرف اس قدر بات معلوم ہوتی ہے، کہ اُس رات گڈریئے بھیڑوں کو لئے ہوئے بیت اللحم کے کھیتوں میں موجود تھے۔ لیکن **انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا** میں کرسمس ڈے کے آرٹیکل پر لکھنے والے نے اس امر پر ایک نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دسمبر کا مہینہ تو ملک یہودیہ میں سخت بارش کا مہینہ ہے، اُن دنوں میں کس طرح بھیڑیں یا گڈریئے کھلے آسمان تلے رہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل چار صدیوں تک ۲۵۔ دسمبر تاریخ ولادت مسیح نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ۵۳۰ء میں **سیتھیا** کا ایک راہب **ڈایونیسس اکسیگزس** نام، جو منجم بھی تھا، تاریخ ولادت مسیح کی تحقیق اور تعین کے لئے مقرر ہوا۔ انجیل کے سوا دنیا کی اُس وقت کی کسی کتاب میں مسیح کا ذکر نہ تھا، انجیل خود اس معاملہ میں خاموش تھی، مسیح سے پانچ چھ صدی پہلے سے ہی ۲۵۔ دسمبر ایک مقدس تاریخ تھی۔ بہت سے سورج دیوتا اسی تاریخ پر یا اس سے ایک آدھ دن بعد پیدا ہو چکے تھے

پھر اس سے بہتر اور کیا تاریخ ہو سکتی تھی۔ اب عیسائی دوست ان واقعات پر غور کریں
اُن کے ہاں دو ہی بڑے تہوار ہیں۔ایک **کرسمس**، دوسرا **ایسٹر** ان تہواروں کے
متعلق جو کچھ بھی وہ جناب مسیحؑ کے متعلق مانتے ہیں، وہ سب کی سب قبل از مسیحؑ آفتاب
پرستی میں موجود ہیں بپتسمہ اور عشاء ربانی بھی پہلے سے موجود ہیں۔خدا کا پیدا ہونا،
نسل انسانی کو اپنے خون سے نجات دینا، انسان اور خدا میں شفیع بننا تو گویا سارے کا
سارا صلیب اور مقدمہ مسیح کا واقعہ اور اس کے کوائف۔الغرض کونسی بات ہے،
جو **پیگن ازم** میں موجود نہیں۔وہی تعلیم اور فلسفہ کلیسا جس کی بنیاد انجیل یوحنا کے
پہلے باب میں ہے یعنی مسئلہ کلام، وہ **پولوس** کی تجویز شدہ ہے۔اُسکو بھی مسیح سے کوئی
تعلق نہیں۔وہ کہاں سے آئی؟ اُس کا ماخذ بھی مسیح سے پہلے موجود ہے حتی کہ وہ اصطلاحیں
بھی جو **پولوس** اور کلیسا کی تحریریں استعمال کرتی ہیں، وہ بھی پہلے کی ہیں۔ان باتوں کے
علاوہ اور جو تہوار آج کیتھلک فرقہ مناتا ہے، وہ بھی سب کے سب پہلے سے ہی موجود تھے۔

رہا یہ امر کہ سورج دیوتاؤں کا ۲۵ دسمبر یا اُس سے ایک دو دن بعد بطن باکرہ سے
ہر جگہ پیدا ہونا۔سورج دیوتوں کا مر کر ایام ایسٹر میں ہی دوبارہ زندہ ہونا، اور ایسی ہی اور
بہت سی باتیں کس طرح دنیا میں پیدا ہو گئیں، یا یہ روایات ایک ہی خط و خال میں کیوں
مختلف ممالک میں دائر و سائر ہو گئیں، حالانکہ اُن میں میکسیکو بھی ہے، جو دیگر ممالک

سے کئی سمندر پار ہے۔ اس پر یورپین مصنفین نے حیرت بھی ظاہر کی ہے لیکن یہ سب کی سب باتیں ذیل کے امور مدنظر رکھنے سے حل ہو جاتی ہیں، عالم حیوانات میں انسان ہی وہ ذی روح وجود ہے، جو اپنے سے بڑی ہستی کا طبعاً پرستار ہے۔ نفع ونقصان یا راحت وتکلیف، جس کا پیش از وقت احساس بھی ادراک انسانی تک ہی مختص ہے، یہ دونوں باتیں اس کی گردن ان کے آگے جھکا دیتی ہیں جن سے اسے نفع کی امید یا نقصان کا خطرہ ہو۔ بت پرستی کی کل روایات کو دیکھ لیا جائے۔ ان سب کی تہ میں یہی دو باتیں ہیں **سرستی دیوی** اور **کالی مائی** کی پرستش بھی نفع ونقصان ہی کے جھگڑے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے جو چیزیں انسان کی سرسری نگاہ نے نفع اور راحت کا باعث دیکھیں، وہی ایسے وقتوں میں جبکہ الہام الٰہی انسانی ہاتھوں سے مغشوش ہو گیا۔ انسان کا رب اور خدا بن گئیں۔ بالمقابل وہ وجود یا وہ واقعات جو مخل نفع وراحت ہوئے، وہی شیطان اور ان کے خداؤں کے دشمن کہلائے بعض گردنیں ان کے آگے بھی جھک گئیں۔ اب اگر ان تمام چیزوں کو خدا کی مخلوق نہ مانا جائے اور مظاہر قدرت کو ہی مختلف خدا اور گروہ شیاطین مان لیا جائے، جیسے کہ اسلام سے پہلے کل مذاہب باطلہ نے مانا۔ تو ان سب مذاہب قدرت میں اگر کوئی وجود رب بلکہ رب الارباب کہلانے کا مستحق ہے تو وہی نیر اعظم **آفتاب** ہے۔ ہم نظام شمسی سے

تعلق رکھتے ہیں۔ اگر اسلامی عقیدے کو ایک طرف رکھ لیا جائے تو پھر آفتاب ہی سب چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔ خود ہماری زمین اسی میں سے نکلی ہے۔ جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی سورج سے ہی نکلا ہے۔ اگر قدیمی دنیا اپنی حاجات کو آفتاب کی طرف لے گئی تو یہ ایک طبعی امر ہے۔ سورج اپنی سالانہ کیفیات مختلفہ میں مختلف تاثیریں زمین پر ڈالتا ہے اس کی تمازت اور اس کی روشنی ہی انسان کی زندگی اور راحت ہے۔ اس کا چھپ جانا۔ یا اس کا ہماری آنکھوں کے سامنے کم و بیش وقت کے لئے آنا۔ ہماری اُمید و بیم کا باعث ہوتا ہے۔ موسم خزاں جو زمین پر ایک موت لے آتی ہے۔ اور موسم بہار جس کے آنے پر زمین دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔ یہ بھی دراصل آفتاب کی ہی مختلف کیفیات ہیں۔ اب اگر ہم اُس زمانہ کو اپنے سامنے رکھیں جبکہ روایات اور قصہ کہانیوں میں مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جب ہر ایک مظہر قدرت کے ساتھ ایک نہ ایک دیوی دیوتا وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ اور اُن مظاہر قدرت کو انسانی خط و خال سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اُن کی پیدائش اور اُن کی زندگی کے بعض واقعات کے دن مقرر کر کے تہوار منائے جاتے تھے۔ یہ واقعات۔ اور یہ پیدائش اور موت کے دن دراصل اُن مظاہر قدرت کی کیفیات سے ہی اخذ ہوتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اِن باتوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ دیوالی۔ بیساکھی۔ بسنت۔ لوہڑی وغیرہ مختلف موسموں کی ہی کیفیتیں

ہیں۔ آجتک کسوف وخسوف کے متعلق پرانی روایتیں یونہی چلی آتی ہیں۔ کہ چندرماں اورسورج دیوتا کسی دیو کے قبضہ میں آگئے ہیں۔ اُن میں اوراُس شیطان میں جنگ ہے جس کے پنجے سے وہ آخر نجات پاتے ہیں۔ اسی طرح سورج کی مختلف کیفیات بھی مختلف داستانوں کا موجب ہوگئیں۔ بوجوہ بالا سے یہ امر مستبعد نظر نہیں آتا کہ ایک وقت دنیا کے بہت سے حصہ کے لوگ کیوں سورج پرست نہ ہوں۔ چنانچہ جناب مسیح کی پیدائش سے پہلے اوراُن کی پیدایش سے تین چار صدی تک جن ممالک کا اس کتاب میں سورج پرستی کے متعلق ذکر آیا ہے، وہ سب کے سب کرہ زمین کے شمالی حصہ میں تھے اس لئے جن آفتابی کیفیات سے ان ممالک میں مختلف مذہبی روایات پیدا ہوئیں، وہ ایک ہی نوعیت اور ایک ہی وقت پر پیدا ہوتی ہیں۔ ان روایات میں دو تاریخیں متمیز ہیں۔ ایک وہ دن جب وقت شمالی کرہ زمین میں سورج اپنی تمازت اور روشنی میں بڑھنے لگتا یا بالفاظ دیگر دن بڑا ہونے لگتا ہے۔ یہ وہی ۲۴ دسمبر کا دن ہے جس کا آغاز ۲۴ دسمبر کے بعد کی نصف رات کے بعد شروع ہوتا ہے۔ وہی وقت متھرا اور دیگر سورج دیوتاؤں کی پیدایش کا دن ہے یہی وہ وقت ہے، جب اُفق مشرق پر ایک طرف اُن ستاروں کا جھنڈ (خوشۂ پروین) نظر آتا ہے، جو برج سنبلہ یا برج کنیا سے وابستہ ہیں یہی وہ وقت ہے جب سورج کی پیدایش کا دن

منایا جاتا تھا۔ اور بعض شناسی قوموں میں پرستار بول اُٹھتے تھے کہ کنواری نے بچہ جنا یہ باتیں مسیح سے پہلے دنیا میں موجود تھیں میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ مصری نقشہ بروج میں سنبلہ یا کنیا کے محاذ میں ایک کنواری بچے کو گود میں لیئے ہوئے کھڑی دکھائی دیتی ہے بعض مصری نقشہ جات میں باکرہ **آئی سس** کو دکھلایا گیا جو **ہورس** کو لئے کھڑی ہے۔ میں یہ دکھلا چکا ہوں کہ مریم اور بچے والا بت **آئی سس** اور **ہورس** کی ہی نقل ہے دوسری طرف جناب مسیح کی پیدایش کا دن ۲۵ دسمبر کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ اب اگر ایک شخص اس بات کے ماننے پر مجبور ہو جائے کہ ولادت مسیح کے واقعات کوئی تاریخی حیثیت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ بلکہ وہی پرانی کہانی ہے تو کیا اگر خصوصاً جب ولادتگاہ مسیح کا طویلہ بقول **شہید جسٹن** وہی **اوجیس** کا اصطبل ہے۔ اس کے متعلق منجمانہ تحقیق یہ ہے کہ شمس پرستی کے قدیمی ایام میں پیدایش سورج کے دن عین زمین کے نیچے برج جوزہ والے ستارے نظر آتے تھے۔ برج جوزہ کا نام **اصطبل اوجیس** ہی تھا۔ (کتاب اُورِسن گوڈ صفحہ ۱۴۸) برج جوزہ کی پیٹی کے ستارے بھی عدد میں تین ہی ہیں۔ ان تین ستاروں کا نام پرانی کتابوں میں تین **بادشاہ** رکھا گیا ہے (ایضاً صفحہ ۱۵۰) الغرض سورج اور مسیح کی پیدایش کے وقت شمس پرستوں کے سر میں کنواری کا خیال تو برج سنبلہ نے دیا اور ولادت گاہ خیال برج جوزہ سے جس کے ہمراہ تین بادشاہ

۲۵۔دسمبر کی صبح کو نظر آتے ہیں۔ عیسائی اصحاب جو پسند فرماویں تشریح کریں +

سورج کی دوسری کیفیت متمیزہ وہ ہے جو موسم بہار میں پیدا ہوتی ہے ۲۵۔
دسمبر سے چلکر ۲۳۔ مارچ تک سورج اپنی طاقت یعنی روشنی اور حرارت میں بڑھتا جاتا ہے
اسبات کو کیسے لطیف شاعرانہ پیرایہ میں سورج دیوتا اپالو کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے اپالو
جب ۲۵۔ دسمبر کو پیدا ہوا تو اُس کے سر پر ایک ہی بال تھا یعنی ایک ہی شعاع ۲۳۔ مارچ
کو سورج اپنے بیضوی دائرے میں گھومتا ہوا خط استوا پر آجاتا ہے جس وقت دن رات
برابر ہوتے ہیں۔ دو دن تک اُس کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ ان کیفیات آفتابی کے
متعلق جو ۲۵۔ دسمبر سے ۲۵۔ مارچ تک پیدا ہوتی ہے پرانی نشاسی روایات یہ تھیں
کہ ظلمت کا دیو جو آفتاب کا دشمن ہے اور جس کے پنجہ سے ۲۵۔ دسمبر کو سورج نکلا ہے
اُس میں اور سورج مہاراج میں ایک مستقل جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جنگ روزانہ
ہوتی ہے۔ اور ہر روز سورج تھوڑا تھوڑا دیو ظلمت پر غالب ہی آتا ہے یعنی دن
بڑھتا جاتا ہے۔ ۲۳۔ مارچ تک تو یہی کیفیت رہتی ہے لیکن اُس کے دو دن تک
سورج کوئی ترقی نہیں کرتا اور ایک ہی جگہ پر کھڑا رہتا ہوا نظر آتا ہے، گویا خدائے نور
اور خدائے ظلمت میں یہ ایک آخری جنگ ہے جس میں وہ خدائے نور یعنی آفتاب
جو ہر روز تھوڑا بہت دیو ظلمت پر غالب ہی آتا تھا۔ اب کچھ ایسا اس کے پنجہ میں آگیا

کہ اس کی رفتار رک گئی۔ وہ بظاہر مر گیا لیکن دو دن کے بعد سورج اسی بڑھنے والی طاقت
کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اسی طرح دیو کے چنگل سے نکلکر آزاد ہو گیا۔ یہ وہ وقت ہے جب
سورج کا بیضوی دائرہ خط استوا پر گزر کر صلیبی شکل پیدا کر دیتا ہے یہی وہ وقت ہے
جب سورج برج حمل میں آ داخل ہوتا ہے جس کی شکل فلکیات میں میمگ یعنی بچھڑے کی کھلائی
گئی ہے یہ وہ بچھڑہ ہے جو ہر ۲۳ دسمبر کو صلیب مذکورہ بالا پر چڑھتا ہے۔ چونکہ اس بچھڑے
کے مصلوب ہونے کے دو دن بعد ہی سورج آب و تاب سے نکلتا ہے یہی وہ وقت
ہے۔ جب سورج کی یہ نئی روز افزوں کیفیت بہار لاکر مردہ زمین کو از سر نو زندہ کرتی ہے
اس لئے مسیح سے پہلے ہی صلیب اور بچھڑا نئی زندگی کا نشان سمجھا گیا جو دو دن کے بعد
آب و تاب سے نکلتا ہے۔ اگر کوئی ان باتوں کو ایک تخلفانہ تشریح کہے تو کہہ بھی سکتا ہے
لیکن اس بات کا کیا جواب ہے کہ مسیح کی پیدایش سے بہت پہلے بچھڑہ اور اس کی قربانی
کا تعلق متھرا ایکس اور اپالو کے ساتھ مسلم ہے۔ صلیب پرستی بھی قدیم سے ہے۔
صلیب قدیم سے ہی نشان زندگی تو مانی گئی ہے۔ اور یہ زندگی تو موسم بہار پر پیدا ہوتی
ہے جس کی تاریخ پھر وہی اخیر مارچ ہے۔ کراس کیک اور انڈے اس موقعہ پر پہلے بھی
کھائے جاتے تھے۔

سورج کی تیسری کیفیت ۲۳-۲۴ جون کو پیدا ہوتی ہے جس دن سورج نے

کمال کو پہنچکر گھٹنا شروع ہوتا ہے، بعض قدیمی شماسیوں نے اسے سورج کی موت کا دن
بھی تصور کیا ہے، چنانچہ اُسی تاریخ کو سورج دیوتا **ایڈونس** قتل ہوتا ہے، اور موسم
بہار میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے، عیسائی روایات میں اس تاریخ کو یوحنا اصطباغی کی تاریخ ولادت
ٹھہرایا گیا ہے۔ تاریخاً اس کا کوئی ثبوت نہیں - لیکن انجیل یوحنا باب ۳۔ آیت ۳۰ سے
اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے۔ جہاں یوحنا مسیح کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ "وہ
تو بڑھے گا اور میں گھٹوں گا" اب اگر مسیح کی پیدائش ۲۵ دسمبر کو ہے اور یوحنا کی
۲۵۔ جون کو تو یہ امر بھی صاف ہو گیا کیونکہ ۲۵۔ دسمبر کے بعد سورج بڑھتا ہے۔ اور
۲۴۔ ۲۵۔ جون کے بعد گھٹتا ہے یعنی ۲۵۔ دسمبر کو وہ پیدا ہوتا ہے جس نے
بڑھنا ہے اور ۲۵۔ جون کو وہ جس نے گھٹنا ہے۔ یہ کوئی تکلفانہ تشریح
نہیں ہے۔ جبکہ انجیل کی بہت سی آیات سورج کی مختلف کیفیات کی طرف ہی
اشارہ کرتی ہیں چنانچہ ذیل میں چند آیات دیتا ہوں آج یہ امر مسلم ہو گیا ہے کہ انجیلیں بہت بعد میں
وقت میں لکھی گئیں جب اس وقت کے معلمان مسیحیت اپنے مذہب کو ہر دلعزیز بنانے
کے لئے شماسی روایات اور **پیگن ازم** کی دوسری روایات کو لگاتار اپنے مذہب
میں داخل کر رہے تھے انجیلوں کے اور بہت سے فقرے بھی اُسی طرف اشارہ کرتے
ہیں یوحنا باب ۳ آیت ۱۳ میں جناب مسیح فرماتے ہیں اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا

اُس کے جو آسمان سے اُترا ہے، ابن آدم بھی جو آسمان میں ہے"۔ یہ فقرہ مسیح کے منہ سے
نہیں نکل سکتا وہ یہودی تھے اور اُن سے پہلے دو بزرگ جو آسمان سے تو نہیں اُترے
تھے لیکن آسمان پر چڑھ گئے تھے۔ ایک ایلیا دوسرا ادریس یا حنوک علاوہ ازیں اُس وقت
تک مسیح آسمان پر نہیں چڑھے تھے۔ پھر وہ تو زمین پر تھے۔ وہ کیسے کہہ سکتے ہیں ابن آدم بھی
جو آسمان میں ہے البتہ شمسی روایات کو سامنے رکھو تو لفظ اس آیت کا حل ہو جاتا
ہے۔ سورج آسمان سے اُتر کر ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوتا ہے۔ وہی آسمان پر چڑھتا ہے۔ وہی
آٹھوں پہر آسمان پر ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کی آیات بھی قابل غور ہیں۔ یوحنا باب ۸ آیت ۱۲
"دنیا کا نور میں ہوں جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائیگا"
دو ہزار برس سے تو آج تک مسیحی نور ہر جگہ نہیں پہنچ سکا لیکن سورج پر یہ فقرہ لفظاً اور معناً
پورا ہوتا ہے۔ پھر یوحنا باب ۹ کی آیت ۴۔۵ حسب ذیل ہے"۔ جس نے مجھے بھیجا ہے
اُس کا کام مجھے جب تک دن رہے کرلینا ہے رات جب آتی ہے تو کوئی کام نہیں کر سکتا
جبتک میں دنیا میں ہوں دنیا کا نور ہوں"۔ یہاں بھی یہ باتیں سورج پر ہی متحقق ہوتی ہیں
مسیح تو دن رات اپنی تبلیغ میں مصروف تھے۔ البتہ آفتاب کے کام کے وقت معین
ہیں۔ اسی قسم کے اور بھی فقرات انجیل میں ہیں۔ خصوصاً انجیل یوحنا میں جسکی تصنیف کے
متعلق یہ امر متحقق ہے کہ وہ مسیح سے کئی صدیوں بعد ہوئی اور اسکندریہ کے مذہب

فلسفہ کے تاثرات سے خالی نہیں لیکن یہاں میں ایک ذیل کا بھی حوالہ دیتا ہوں یعنی یوحنا
باب ۱ پ ۹، "حقیقی نور جو ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے۔ دنیا میں آنے کو تھا، دنیا میں تھا،
اور دنیا اس کے وسیلے سے پیدا ہوئی۔" خوش اعتقادی کو چھوڑ کر ان الفاظ پر غور کرو۔ یہ
لفظاً اور معناً سورج اور اس کے عمل کو ظاہر نہیں کرتے تو اور کس چیز کو ظاہر کرتے ہیں۔ سورج
ہی آٹھوں پہر دنیا میں ہے۔ سورج سے ہی زمین نکلی۔ اور زمین سے انسان۔ نہ صرف
سورج آدمی کو روشن کرتا ہے بلکہ انسان کے اندر جو کچھ بھی ہے اس کا گوشت۔ پوست
دل۔ دماغ یہ سب کا سب سورج ہی کے **وسیلے** سے ہے۔ یہ ایک علمی حقیقت ہے
جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کی روشنی میں یوحنا کے ان الفاظ کو پڑھو
تو پھر یہ الفاظ سورج ہی پر چسپاں ہوتے ہیں۔ ہاں! اگر اس نظریہ کو سامنے رکھا جائے
جسے ان اوراق نے مبرہن کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے۔ کہ قدیمی راہبوں نے جن میں
سے ایک انجیل یوحنا کا مصنف بھی تھا مسیح کو شمس پرستوں کے سامنے قدیمی سورج
دیوتاؤں کا ایک قایم مقام پیش کیا۔ اور اس کے متعلق وہی باتیں لکھیں جو شمس پرستون
میں وارد و ساری تھیں۔ سورج کی چوتھی کیفیت ۲۳ ستمبر کو واقعہ ہوتی ہے جس کے
بعد سورج بالکل ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ دن گھٹنے لگتا ہے اور ایک ماہ بعد یعنی ۲۳۔
اکتوبر کو سرما آجاتی ہے۔ ہندوستان سے کسی قدر اور شمال میں اگر ان دونوں جا کر دیکھا

جاوے تو دن بھی چنداں روشن نظر نہیں آتا حتّٰی کہ ایران کے شمال میں نو گھنٹے تک دن آجاتا ہے۔ یہ کیفیت اُسی وقت شروع ہوتی ہے جب آفتاب برج عقرب میں آجاتا ہے سورج دیوتا کے دشمن کی تصویر جو سورج پرستوں نے کھینچی ہے وہ عقرب کی ہے جس کی دم خاردار ہے، مسیحی تحریروں میں شیطان یا دیو ظلمت کو بیشک سانپ سے نسبت دیگئی ہے لیکن جہاں شیطان کو انسان کی شکل میں دکھلاتے ہیں وہاں اس کی دم خارداری دکھلائی جاتی ہے، وہ لمبا کوٹ پہنے ہوئے تو نظر آتا ہے لیکن خاردار دم کو نہیں چھپا سکتا، یہ مانا کہ سانپ تو قصہ آدم سے لے لیا گیا ہو، لیکن دنیا میں وہ کونسا سانپ ہے جس کی دم خاردار ہو۔ اب اگر مسیحؑ آفتاب صداقت ہے تو پھر اس آفتاب پر دیو ظلمت اُسی وقت غالب آتا ہے جب وہ برج عقرب میں جاتا ہے، بہت سی اور باتیں مسیحی مذہب میں جو نہ صرف شمس پرستی سے بلکہ پیگن ازم کی دوسری شاخوں سے بھی لی گئی ہیں مسیح کے بارہ حواری ہوں یا **اپالو** کے یا **ہرکولیس** کے بارہ کارنامے۔ یہ وہی بارہ برج ہیں آخر **اپالو** یا **ہرکولیس** کوئی تاریخی ہستیاں نہیں۔ وہ تو شاسی تخیلات کی ایک تصویر ہے، اگر اُن کے بارہ دوست مسلّمہ بارہ برج ہیں تو وہی تشریح حواریوں کی تعداد پر کیوں حاوی نہیں۔ پھر **یہودا اسکریوطی** ہی نہیں اُس سے پہلے بھی بارہ میں سے ایک پہلے سورج دیوتاؤں کو گرفتار کراتا ہے وہ **برج عقرب** نہ سہی

برج قوس سبھی بارہ میں سے ایک برج میں جاکر سورج بالکل کمزور ہو جاتا ہے
اگرچہ متقدمین نے عقرب کو ہی لیا ہے ہیں نے اوپر لکھا ہے کہ مسیح کا دوسری
تیسری صدی تک نشان مچھلی تھی جن لوگوں نے مسیح کی پیدائش ۲۵- دسمبر ٹھہرائی
ہے۔ وہ تاریخ قرار حمل کے لئے وہی مہینہ تجویز کریں گے، جب سورج بُرج حوت
میں ہو گا، یہ باتیں اور بھی مضبوط ہو جاتی ہیں، جب ہم کیتھلک تہواروں کی دوسری
تاریخوں کو دیکھتے ہیں، مثلاً کیتھلک مذہب میں ایک تہوار ۱۵- اگست کو منایا جاتا
ہے۔ جسے ایسنشن آف دی ورجن کہتے ہیں یعنی خدا کے نور نے مریم کو لے لیا
اور وہ زمین سے غائب ہو گئی۔ ہماری اصطلاح میں اُسے معراج مریم کہہ دیجئے۔
اسی طرح تاریخ پیدائش مریم ۸ ستمبر مانی گئی ہے۔ ان دونوں تاریخوں کو بھی سورج
اور بُرج سنبلہ یعنی کنیا سے تعلق ہے۔ ۱۵- اگست کو وہ ستارے جو بُرج کنیا کے
پاس ہوتے ہیں۔ سورج کے قریب آجانے اور برج سنبلہ میں داخل ہونے سے
نظر نہیں آتے، یہ وہی تاریخ ہے جس وقت کنیا کے ستارے چھپ جاتے ہیں۔
پھر ۸- ستمبر کو پروین سنبلہ یعنی کنیا نظر آجاتی ہے۔ مریم کے طہر کی تاریخ فروری کو منائی
جاتی ہے۔ اُس میں موی شمعیں ہاتھ میں لے کر پادری چلتے ہیں چنانچہ اسے **کینڈل**
ماس کہتے ہیں۔ رومی بت پرست اسی مہینہ میں ایک ہی وقت دو تہوار مناتے

تھے۔ ایک تو دیوی جنو کے طہر کا وہ دن تھا دوسرا باکرہ سیریس یہ اہر یا مین
کی تلاش میں شمع جلائے نکلتی تھی، رومیوں کے ہاں ابتدائے نومبر میں مردگان کی یاد
میں ایک تقریب منائی جاتی تھی۔ جب خیال کیا جاتا تھا کہ اُن کی روحیں آتی ہیں۔
آج ہم اُسی تاریخ پر کیتھلک فرقہ میں یوم ارواح کو پاتے ہیں۔ ۲۸۔ دسمبر کو جو کیتھلک کے
ہاں قتل معصومین کا دن ہے اُسی تاریخ کو رومی لوگ ایسی ہی روایت کا ایکدن مناتے تھے
اب میں صرف ایک اور بات کا ذکر کر کے ان پرانی کہانیوں کو ختم کرتا ہوں، یہ امر تو شہید
جسٹن کے بیان سے ثابت ہو گیا کہ عشاء ربانی متھراپرستی میں ہوا کرتی تھی، متھرا مذہب مسیح سے
پہلے کئی صدیوں ایران میں تھا، ستر برس مسیح سے پہلے اُس کا دور دورہ سلطنت روما میں
شروع ہوا، جہاں سے یہ مذہب کل یورپ میں پھیل گیا۔ آئرلینڈ کے علاوہ انگلستان کے بعض
مقامات مثلاً چسٹر اور یورپ میں اس کے کھنڈرات آج پائے گئے ہیں، بہرحال عشاء
ربانی کے متعلق جو عقیدہ عیسائیوں کا ہے، اس عقیدے سے پرانی دنیا خالی نہ تھی، عشاء
ربانی کی روٹی اور شراب گویا جناب مسیح کے جسم اور خون کی یادگار ہے جسے چکھ کر ایک پرستار کا جسم اور
خون مسیح کا جسم اور خون ہو جاتا ہے جس طرح مسیح کے خون سے انسان کے گناہوں کا دھل جانا بھی ایک پرانی
بات ہے۔ ڈایونیس کے خون سے بھی انسانوں کی پاکیزگی ہوتی تھی دیگین اینڈ کرسچن کریڈ
صفحہ ۶۵)، قدیمی مصری اسیرس کے دوبارہ زندہ ہونے پر عشاء ربانی کی رسم مناتے تھے بعد میں

روٹی کھائی جاتی تھی جس پر پہلے کاہن تقدیس دیتا تھا جس سے وہ اسیرس کا گوشت ہو جاتی تھی (کتاب دی گریٹ لا آف ریلیجس آوریجن مصنفہ ولیم سن صفحہ ۱۰۵) ڈاکٹر فریزر اپنی کتاب گولڈن باؤ میں ایک امریکن قوم کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ لوگ ماہ دسمبر میں اپنے بڑے دیوتا کا ایک بت خمیرے آٹے سے بناتے تھے پھر اُسے توڑ کر کھاتے تھے **لنگریانو** نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۰ پر اہل میکسیکو کی عشاء ربانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ روٹی بناتے پھر اس کے ٹکڑے کرتے اور پھر اُن کا مذہبی پیشوا اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کو ہر ایک پرستار کے منہ میں ڈالتا اور اسے سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے خدا کا گوشت کھا رہے ہیں یہ تو خیر پرانی باتیں ہیں آج بھی چینی لوگ شراب کو کنفیوشس کے تبلیوں سے بنے ہوئے مجسمے پر ڈالتے ہیں پھر اُس شراب کو پیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کنفیوشس کی برکت اُن میں آگئی اسی قسم کی باتیں چینی تاتاریوں میں عام طور پر جنہیں آج **فادر گروبر** دیکھکر وہی کہتا ہے جو صدیوں پہلے **شہید جسٹن** نے کہا میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ شیطان تاتاریوں میں کیتھلک کلیسا کی پوری نقل اُتار رہا ہے۔ حالانکہ نہ وہاں کوئی عیسائی گیا ہے نہ کوئی یورپین لیکن وہ لوگ بالکل کیتھلک کلیسا کی باتیں کرتے ہیں حتّٰی کہ عشاء ربانی بھی شراب اور روٹی سے بناتے ہیں یہ باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں (انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف ریلیجنز مصنفہ جیون صفحہ $\frac{۱۴۸}{۲۱۹}$) یہ مسئلہ کہ ابن آدم نے آکر نسل انسانی کو اگر گناہ سے نجات دی۔ کوئی نیا مسئلہ نہیں

جن ینگین دیوتاؤں کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں **متھرا ہورس۔ ہرکولیس ایڈونس**
ان سب کی مائیں کنواری ہی تھیں، سب کے سب یا مسیح کی سی موت سے مرے، یا خود انہوں نے
اپنی جان دی۔ ان سب کے خون نے لوگوں کے گناہ دھوئے۔ یہ سب کے سب پھر جی اُٹھے،
نیپال اور تبت میں **اندر دیوتا** اپنے خون سے ہی انسان کو نجات دیتا ہے، یہ خون ہی
آسمانی بارش ہے جو بارش کے دیوتا **اندر** کے جسم سے نکل کر زمین کے رہنے والوں کو ہر مصیبت سے
نجات دیتا ہے۔ دوسری طرف **سورج دیوتا** کے جسم سے سُرخ شعاؤں کی شکل میں خون
اُتر کر زمین کو نئی زندگی بخشتا ہے، اس زندگی کے بخشنے کے ایام **ایسٹر** کے دن سے شروع ہوتے
ہیں جس سے دو دن پہلے **سورج دیوتا** بچھڑے کی شکل میں یعنی برج حمل میں اس صلیب پہ
چڑھتا ہے جو اس کی سالانہ حرکت کا بیضوی دائرہ ہے خط استوا پر بناتا ہے مسیح نے ہی پہلے
انسان کے گناہ سر پہ نہیں اُٹھائے جناب بُدھ نے بھی ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ کل دنیا کے گناہ
مجھ پر لاد دو تاکہ دنیا نجات پائے (تاریخ سنسکرت لٹریچر مصنفہ میکس میولر، **سکینڈی نیویا کا** خدا
اوڈن جو خود ہی درخت کے ذریعہ پھانسی پر چڑھا وہ کہتا ہے "میں جانتا ہوں کہ میں خود ہی پھانسی
پر چڑھا تھا، مجھ کو برچھی چبھوئی گئی، میں خود اوڈن یعنی اپنے آپ سے یہ کہا تھا، کہ میں ایسا کرونگا"۔ **کرشن جی**
مہاراج کہتے ہیں "میں خود ہی قربانی ہوں، یہ جو لوگ چڑھاوے چڑھاتے ہیں وہ میں خود ہوں"، **اندر**
سوم۔ ہری اور دوسرے دیوتا مختلف جانوروں کی شکل میں آکر نسل انسانی کے بچانے کیلئے قربان ہوئے

ہیں"۔ **شوجی** مہاراج کہتے ہیں" اصل چڑھاوے کا جانور تو میں خود ہوں، جسے تم میرے نیچے پر ذبح کرتے ہو وہ میں ہی ہوں"۔ بدھ ملاء اعلیٰ سے انسان کو عذاب سے بچانے کیلئے دنیا میں جنم لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے کہ میں اگر انسانی جسم اختیار کرنے لگا ہوں تو اسلئے نہیں کہ کوئی عیش وعشرت کروں۔ بلکہ اسلئے کہ انسانوں میں پیدا ہو کر جسم اور گوشت (انسان) کو تکالیف سے بچاؤں اور ان کے دکھ درد دور کروں"

چین کا معبود **طین** نام دنیا میں اسلئے آیا کہ راستبازی کو قایم کرے نسل انسانی کے بچانے کیلئے اور دنیا کو موت سے نجات دینے کیلئے وہ مرتا ہے کیونکہ اُسکے نزدیک خداوند کے حضور اس سے بہتر قربانی نہیں۔ دیکھیں انیڈیا اس مصنفہ پریگ جلد اول صفحہ ۲۱) **اڈونس** کی موت کی یاد کی رسم میں بڑا کاہن یہ الفاظ کہتا ہے" اپنے خداوند پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ جو کچھ تکالیف اس نے سہیں وہ ہماری ہی نجات کیلئے سہیں"۔ الغرض کل کے کل ممالک جو زمانہ قدیم میں کائنات اور عناصر کی مختلف حیثیتوں کے پرستار تھے اور انہیں کائناتی کیفیات کو انہوں نے خدا اور دیوتے تو بنا رکھے تھے ان میں سے اکثر سورج پرست تھے۔ اسی ایک عقیدہ کے پرستار نظر آتے ہیں کہ انسان کی مصیبت اور تکلیف سے نجات اسی میں ہے کہ خود خدا تکلیف اُٹھائے۔ سورج کو ہی دیکھ لیا جائے جس سے ہمارے کل کے کل جسمانی بقا وابستہ ہیں۔ اسکی روشنی اور گرمی ہماری سب تکالیف کا علاج کرتی ہے اب اسکا گھٹنا بڑھنا اگر اُسکی تکلیف وراحت سمجھ لیا جائے۔ اسکا گہن میں آجانا۔ اسکی سکرات موت قرار دی جائے اور اسے خدا مان لیا جائے جو انسانی جامہ میں زمین پر آئے تو کیا وہ اپنی موت اور تکلیف کو برداشت

کرکے نسل انسانی کو نجات نہیں دیتا۔ یہ سب کی سب باتیں ہر جگہ موجود تھیں۔ قدیمی لوگوں کا ایمان نہیں کہاں ہو
سے ترو تازگی پاتا تھا مسیح کی پیدائش پہ یہ سب باتیں موجود تھیں وہ قصے پرانے ہو چکے تھے راہبوں نے
ان سبکو مسیح کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس میں کیا شک ہے کہ جناب مسیح خدا کے پیارے نبی تھے۔
عین ضرورت کے وقت حضرت مریم صدیقہ کے بطن سے پیدا ہو کر یہودیوں کی اصلاح کیلئے آئے ضرورت وقت کے
لحاظ سے بہتر سے بہتر ہدایات دیگئے آج بھی اُنکی باتیں قابل عزت ہیں۔ اُنکے وقت کے یہودی علماء ریاکاری
اور منافقت کا مجسمہ تھے۔ اُنکے نفاق کو آپنے طشت ازبام کیا جناب مسیح کے ربانی علم کے مقابل اُنکے علم
کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان باتوں سے علمائے وقت آپکے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے آپکی تکذیب و تکفیر کی طرح طرح کی
اذیتیں پہنچائیں لیکن جب وہ خدا کا نبی اپنے فرض منصبی سے نہ رُکا۔ تو اُن پر سڈیشن کا الزام لگا کر عدالت
میں کھینچا گیا۔ اُن پر موت کا فتویٰ حاصل کرکے اُنکو صلیب تک پہنچا یا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے آپکو اس لعنتی موت سے
بچا کر آخر کار رفعت روحانی عطا فرمائی۔ یہ سب صحیح ہے اسپر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن آپکے نادان دوستوں نے غلو محبت
میں آکر آپکے اصلی واقعات کو تو اہمیت نہ دی بلکہ آپکے سوانح میں بت پرستی اور کفر والحاد کی پرانی روایات کو
داخل کر گئے انہیں سورج پرست دنیا کے سامنے ایک سورج دیوتا کی شان میں پیش کر دیا۔ اُن دیوتاؤں کے قصے
بھی انسانی لباس میں ہی تھے اُنکے بعض واقعات بھی انسانی تھے اسلئے مسیح کی زندگی کے ملتے جلتے واقعات کو بھی
قائم رکھا، لیکن اُن واقعات حقہ پر کچھ اس قدر شمسی رنگ چڑھایا، اور اسبات کی کوشش کی، کہ جو کچھ بھی روایات
پارینہ میں تھا، وہ آپکے سوانح میں، آپکے متعلق یہانتک بھر دیا، کہ آج آپکے وجود سے بھی بعض محققین منحرف ہو گئے

انکار کرنا پڑا۔ امر حقہ یہ ہے کہ اُس وقت کی وہاں کی دنیا ایک ربانی معلم کی حیثیت میں کسی شخص کو وہ عزت دینے کیلئے تیار نہ تھی جو اُن کے دلوں میں ان داستانوں کے ہیرو کی ہوا کرتی تھی چنانچہ مسیح کو بھی اسی قسم کی داستانوں کا ایک ہیرو بنا دیا گیا۔ ابتدائی مسیحی صدیوں میں محبوب سے محبوب ہیرو تین چار تھے ایڈونس بیکس۔ اسیرس متھرا۔ ان میں سے کسیکو لیلو، ان سب کی کہانیوں میں وہی باتیں موجود ہیں جو قدیمی مسیحی راہبوں نے جناب مسیح کے بعض اصلی واقعات پر ایزاد کر دیں حتی کہ وہ سب کے سب الفاظ والقاب جن سے جناب مسیح کو آجتک مسیحی دنیا یاد کرتی رہی۔ ان میں سے ہر ایک کے پرستار ان سورج دیوتاؤں کے متعلق استعمال کرتے تھے میں نے اس کتاب میں اُن کے کچھ کچھ حالات دیدیئے ہیں بیتھر بیکس دیوتا کی یہاں چند باتیں لکھدیتا ہوں۔ پڑھنے والے خود پڑھکر دیکھ لیں کہ وہ مسیح کی ہیں یا بیکس کی

وھوھذا

"وہین کل گناہ اور ناراستی سے بھری ہوئی تھی، اور ہلاکت کے منہ میں آئی ہوئی تھی۔ جوپیٹر (خدا) نے ارادہ کیا کہ وہ دنیا اور انسان کو مصیبت سے بچائے۔ اور اپنا اکلوتا بیٹا بھیجکر دنیا کو ہلاکت سے نجات دے۔ وہی کل دنیا کا معبود ہوا اور دنیا اُسکی تقدیس کے گیت گاتے۔ چنانچہ جوپیٹر (خدا) نے ایک عفیفہ کنواری پر سایہ ڈالا، وہ حاملہ ہوگئی، اور اُس نے دنیا کے نجات دہندہ کو جنا۔ وہ دنیا میں آیا، اُس نے انسانوں کے دکھ درد دور کرنے کیلئے اپنے آپکو دکھ اور درد میں ڈالا، اور مارا گیا۔ اُسکے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اُسکے پرستار اس کو ان ناموں سے یاد کرتے تھے۔ اکلوتا بیٹا۔ المقتول۔ گنہ اٹھانیوالا۔ منجی۔"

آج مسیح کے متعلق یہ قول ہم بائبل میں پڑھتے ہیں کہ میں دنیا کا الفا اور اُمیگا (دنیا کی ابتداء و انتہا) ہوں۔ اور خداوند بیکس نسل انسانی کو کہتا ہے (بائبل متھس مصنفہ ڈون صفحہ ۱۹۳)

"میں ہی ہوں جو تمہارا ہادی ہوں، میں ہی ہوں جو تمہارا حافظ ہوں، میں ہی ہوں جو تمہارا منجی ہوں، میں ہی الفا اور اُمیگا ہوں"

مسیحی منادا الوہیت مسیح کے ثبوت میں اکثر مسیح کے چند فقرات کیطرف اشارہ کرکے اسبات پر زور دیتے ہیں

کہ اس کے الفاظ میں ایک آلہی اقتدار ہے۔ اسی کے ضمن میں وہ **الفا** اور **اُمیگا** والے قول کو بھی پیش کیا کرتے ہیں لیکن کیا **بیکس** کے الفاظ متذکرہ میں کچھ کم اقتدار پایا جاتا ہے؟

عشائے ربانی۔ اس رسم کی حقیقت تو یہ ہے۔ کہ روٹی اور شراب جو مسیح کی یاد میں اتوار کے دن گرجے کی عبادت کے بعد کھائی پی جاتی ہے، وہ مقدس ہو جاتی ہے، اور کھانیوالے میں ایک قسم کی قدوسیت پیدا کر دیتی ہے کسی جگہ مشرقی ممالک میں جا کر دیکھو۔ جہاں کوئی چیز قربان ہوتی ہے وہ مقدس ہو جاتی ہے۔ چڑھاوے کا گوشت ہر جگہ بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ اسکے کھانے سے عامہ عقیدہ کے ماتحت کھانیوالے میں برکت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے، انہی باتوں کی دوسری شکل **عیسائی عشاء ربانی** ہے، آخر حقیقت تو ایک ہے! ایک ہستی قربان ہوتی ہے، وہ جانور ہو یا انسان۔ جانور کا تو گوشت اور بعض قوموں میں خون کھانیوالے میں اسلئے پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جانور خدائی ذبح پر چڑھکر الوہیت کا رنگ اپنے اندر پیدا کرے لیکن انسان کے متعلق آج وہ وقت نہیں کہ انسان کا بھی گوشت کھا لیا جائے۔ اگرچہ تاریخ عالم میں ایسا زمانہ گزرا ہے کہ مقتول اور مصلوب منجیوں کی یاد میں انسان ذبح ہوتے اور انکا خون و گوشت کھایا جاتا۔ آج خون اور گوشت کی جگہ روٹی اور شراب کھا پی جاتی ہے اور وہ بھی عیسائیت سے مختص نہیں بات ایک ہی ہے جو قربان ہوا اُسے انسان نے خدا بنایا۔ آج خدا نہیں لیکن منبع ضرور ہو جاتا ہے۔ ستی ہونیوالی بیبیاں جب چتا پر چڑھنے جاتی تھیں، تو خدا کا اوتار ہی سمجھی جاتی تھیں اُن سے مرادیں مانگنا، اُن کے جسم کو ہاتھ لگانا، جو وہ کسی کے حق میں کہدیں اُسے خدا ہی کی بات سمجھنا یہ تو سب قربانی کے کرشمے ہیں۔ جسے ایک قوم نے الٰہیات میں داخل کر لیا۔

مسیحی فلسفہ اور کلیسی مصطلحات

کلیسیا کے سرائر اور باطنیات پر مَیں نے باب گذشتہ میں کماحقہ بحث کر دی ہے۔
اس ساری تحریر میں میں نے زیادہ تر مورخانہ حیثیت سے کام لیا ہے۔ ضروری اور طبعی تنقید کے علاوہ اپنی رائے دینے سے بھی احتراز کیا ہے۔ مَیں عیسائی دوستوں پر ہی چھوڑتا ہوں۔ کہ ان باتوں کے ہوتے ہوئے ہم میں سے کوئی اُن سے کس طرح متفق ہو جائے۔ وہ کونسی بات ہے۔ جو پہلے سے ہی بت پرستوں میں موجود نہیں۔ یہ تو وہی سورج اور بہار کی کیفیات کے نقشے ہیں۔ جو قدیم سے چلے آتے ہیں۔ انسان کی مشرکانہ طبیعت نے الہیات چھوڑ ہر ایک مظہر قدرت کو بت پرستی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اُسی کا ورثہ کلیسیا میں بھی آیا ہے۔ مسئلہ تثلیث بھی ایک پرانی کہانی ہے۔ ہندوستان پہلے سے ہی برہما۔ وشن۔ مہیش کا پرستار تھا۔ یہ بھی نظارۂ کائنات کے ہی مختلف نقشے ہیں۔ زمین پر ہمیشہ پیدائش۔ پرورش اور ہلاکت کا دور مستقل جاری ہے۔
اسی حقیقت کو شاکتک مت نے غلیظ الفاظ میں **پاربتی۔ برما۔ وشن۔ مہیش** کو جمع کر دیا ہے۔ وہی قوت خلق اور وہی قوت نمود پرورش) اور وہی قوت ہالکہ اور وہی زمین جس پر ان تینوں قوتوں نے عمل کرنا ہے۔ اگر ہندوستان میں **برہما۔ وشن۔ مہیش**

اور پاربتی ہے۔ تو دوسری جگہ باپ - روح القدس - بیٹا اور مریم ہے یہی تین میں ایک اور ایک میں تین ہیں۔ وہاں پرانے تخیل نے ان حقائق کو مشرکانہ رنگ میں دیکھا ہر ایک چیز کو خدا بنا کر انہیں انسانی جامہ میں اتارا یہاں عیسائیت نے بھی مسیح کا حقیقی مذہب چھوڑا اس امر میں تصویر پرستی کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی عقل ابھی اسی قابل تھی کہ بت پرستی میں ہی اطمینان دیکھے۔ بہرحال آج عیسائیت کے سوا جب کل دنیا نے ان ہستیوں کو تخیل کی ہستیاں قرار دے دیا۔ تو پھر کیوں کلیسی داستان کی یہی تعبیر نہ کی جائے مسئلہ تثلیث کے متعلق میں قدیمی یونانیوں کی ایک حکیمانہ حقیقت پر روشنی ڈالتا ہوں۔ اس زمانہ کے لوگ ہر ایک چیز میں ایک روح کو قائم کرکے اُسے اپنا معبود ٹھہراتے تھے۔ اور یونانی اسے **رب النوع** کہتے تھے۔ چنانچہ برس کا بھی ایک رب النوع تھا جس کی تین کیفیتیں بتائی جاتی تھیں۔ پہلی کیفیت میں وہ زندہ ہوتا ہے۔ دوسری میں وہ مرتا ہے تیسری میں پھر جی اٹھتا ہے۔ اور جی اٹھنے کے ساتھ ہی کل دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ اس تیسری کیفیت کو یونانی ایک الگ مستقل وجود میں دیکھتے تھے۔ اس کا نام وہ **الثالث** یا **نجات دہندہ** رکھتے تھے۔ اب غور کرلو۔ کیا عیسائیت کی کہانی مختصر شکل میں وہی یونانی نہیں؟ وہی روح (خدا) کا پیدا ہونا۔ وہی مرنا۔ وہی پھر جی اٹھنا۔ وہی اپنے جی اٹھنے کے ساتھ دنیا کو زندگی بخشنا۔ وہی تین میں ایک اور ایک میں تین +

(فورسٹیجز صفحہ ۱۰۴ مصنفہ گلبرٹ مرے)

عیسائی فلسفہ کی بنیاد جس سے مسئلہ تثلیث اخذ کیا گیا۔ کچھ تو انجیل یوحنا کی ابتدائی آیات نے اور کچھ پولوس کی تحریرات نے ڈالی تھی۔ انجیل یوحنا کی ابتدائی آیات میں ایک خاص اور بظاہر ایک نئی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے۔ وہ آیات حسب ذیل ہیں:۔

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کی ذات دراصل خدا ہی ہے جس کی پہلی شکل وہ **کلام** ہے، جس کا ان آیات میں حوالہ دیا گیا یعنی مسیح بشکل کلام خدا میں سے نکلا۔ پھر اُسی سے سب دُنیا بنی۔ اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ کلام کے ذریعہ بنا۔ اور اب تک قائم ہے اس حقیقت کو ایک خاص انکشاف ربانی تسلیم کیا گیا ہے جس کا الہام یوحنا رسول کو ہوا حسب تعلیم کلیسیا یوحنا کی اس تحریر سے پہلے دُنیا کے علم میں یہ صداقت موجود نہ تھی۔ یہ بات یہاں تک تو صحیح ہے کہ اس امر کا پتہ عہدنامہ قدیم کے کسی صحیفہ سے نہیں چلتا۔ ان آیات کے مختلف ٹکڑوں نے پولوس کے لٹریچر میں نئی سے نئی اصطلاحیں اور نئی سے نئی توجیہیں پیدا کردی ہیں۔ پولوس کے بعد کل کلیسی لٹریچر اسی ایک رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے

یہاں نہ تو میں اُن تحریروں کا خلاصہ دیتا ہوں۔ اور نہ پولوس کی باتوں کا اقتباس کرتا ہوں میں صرف اُن مصطلحات کا ذکر کر دیتا ہوں جن سے مسیح ان سب تحریروں میں اور آج بھی عیسائی سرمنوں (وعظوں) میں موسوم کیا جاتا ہے۔ اُن سب کی بنیاد و اصل یہی آیات سمجھی جاتی ہیں اور جس طرح یہ مصطلحات بنائی گئی ہیں۔ اُنکی یہاں مختصر سی توضیح بھی کر دیتا ہوں۔ ان آیات میں کلام سے مراد مسیح ہے۔

"ابتداء میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔" اس لئے کلام یعنی مسیح خدا کا پلوٹھا بیٹا ہے۔ چونکہ کلام خدا سے نکلا ہے اور وہ خدا ہے۔ اس لئے کلام (مسیح) دوسرا خدا ہے۔ اور تخت الوہیت پر خدا کے ساتھ بلا فرق بیٹھا ہے۔ اس لئے خدا میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ وہ خود خدا کی تصویر ہے۔ چونکہ ان آیات کے مطابق کلام سے ہی ساری چیزیں بنی ہیں۔ اور اُسی سے سب چیزوں نے زندگی پائی ہے۔ اس لئے کلام (مسیح) ہی خدا کی منشا کو دنیا پر ظاہر کرتا ہے یعنی وہ **خدا کا ترجمان** ہے۔ اور چونکہ دنیا کا بہترین خلاصہ انسان ہے۔ اس لئے **کلام** (مسیح) انسان کی شکل میں آیا۔ پھر چونکہ اسی سے دُنیا نے روشنی پائی۔ اس لئے وہی **کلام** (مسیح) خالق اور مخلوق میں ایک **واسطہ** ہو گیا۔ اور واسطہ ہونے کی حیثیت میں وہ خالق خدا کے آگے مخلوق کا **سفارشی یا نجات دلانیوالا** ٹھہرا۔ اس لئے اس کا نام **بڑا کاہن** بھی رکھا گیا۔ یہی **کلام** (مسیح)، وہ سرچشمہ حکمت و زندگی ہے جس سے انسان **حیات ابدی** کا پانی پیتا ہے۔ اسی لئے وہی **شفا دہندہ**

اور بیماریوں ، کا **علاج کرنیوالا** ہے۔ کلام (مسیح) چونکہ خدا سے ہے اور اُس کی پیدائش آسمانی ہے اس لئے وہ ہر ایک گناہ اور عیب سے پاک ہے۔ چونکہ اُسی سے روح انسان کو طاقت ملتی ہے۔ اس لئے وہی **ربانی روٹی** ہے۔ وہی انسان کا خبر گیر ہے۔ اس لئے وہی **مقدس گڈریہ** ہے جو خدا کے **گلے کا نگہبان** ہے۔ انسان اگر نجات پاسکتا ہے تو اسی صورت میں کہ اپنے قول و فعل کو کلام (مسیح) کے **مطابق** کرے۔ کیونکہ وہی خدا کا **قائمقام** ہے۔ انسان چونکہ گنہگار ہے۔ اور اس کی نجات اسی کلام (مسیح) کے ذریعہ سے ہے۔ اس لئے مسیح ہی انسان کے گناہوں کا عوضہ دیتا ہے اور **گناہ کی قیمت** ہے۔ خدا بھی اسی کلام کے ذریعہ انسان کو پستی سے نکال کر بلند کرتا ہے۔ اور انسان کو اپنے پاس لے آتا ہے۔ لہذا انسان کے اعمال کچھ چیز نہیں۔ اس لئے اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اُس کلام (مسیح) پر ایمان لائے +

ان سطور بالا میں مَیں نے بیسیوں عیسوی کتابوں اور بیسیوں کلیسی سرمنوں کا خلاصہ دیدیا ہے میرے مطالعہ میں آئی ہوئی ان کتابوں یا سرمنوں کے علاوہ پولوس سے لے کر آج تک جو کچھ مسیحی فلسفہ اور لٹریچر میں لکھا گیا۔ یا جو مسیحی منبر (پلیٹ فارم) سے آواز آئی ان سب کا نچوڑ بھی یہی ہے۔ مَیں پھر دوبارہ ان مصطلحات کو جن سے کلام یا مسیح موسوم کیا گیا۔ اختصاراً ذیل میں لکھتا ہوں تاکہ ان پر جو مَیں تنقید کروں وہ صریح الفہم ہو جاوے +

خدا کا کلام۔ دوسرا خدا۔ خدا کا پلوٹھا بیٹا۔ خدا کے ساتھ بیٹھا ہوا۔ خدا کے ساتھ بلا فرق تخت پر بیٹھا ہوا۔ خدا کی تصویر۔ خدا کا ترجمان۔ مخلوق اور خالق میں منجی۔ شفیع یا نجات دہندہ۔ خدا اور انسان میں واسطہ روحانی طبیب یا شفا دہندہ۔ ابدی حیات کا پانی پلانے والا۔ زندگی کی روٹی۔ مقدس اسوہ۔ خدا کا نائب مقدس گڈریہ۔ خدا تک پہنچانے والا۔ گناہ کی قیمت سب چیزوں پر حکمران۔ خود خدا۔ گناہوں سے معصوم بڑا کاہن۔ دنیا کی روشنی۔ خدا کا پیارا بیٹا +

یہی چند باتیں عیسائی فلسفہ کی مایۂ ناز ہیں۔ اس فلسفہ کی بنیاد الہام مانا گیا ہے اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ الہام دنیا میں سب سے اول انجیل یوحنا کے لکھنے والے یا پولوسی لٹریچر کے مصنف کو ہوا۔ کیونکہ آج یہ بات بھی ایک حد تک تسلیم کی گئی ہے۔ کہ یہ تحریریں جو پولوس یا یوحنا کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ در اصل اُن کی نہیں۔ بہرحال مجھے یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان باتوں کا سرچشمہ یا ماخذ خدا کا الہام ہے یا انسانی دماغ اور وہ انسانی دماغ مسیح سے پہلے کا ہے یا بعد کا +

آج تحقیق اور تدقیق کا زمانہ ہے۔ مغربی تحقیق نے بال کی کھال اُتاری ہے۔ خدا مسلمانوں کا بھلا کرے کہ جنہوں نے فتح قسطنطنیہ کے بعد یونانی علمی خزانے اور اسکندریہ کے علمی جواہر ریزے عربی زبان میں ترجمہ کر کے دنیا میں محفوظ کر دئے۔ اُن کی تحریروں نے متاخرین کو اصلی کتابوں کی طرف متوجہ کیا۔ اصلی کتابیں بھی مسلم امین ہاتھوں نے اپنے کتب خانوں میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ وہ انقلاب زمانہ نے ہمارے گھروں سے نکال کر فرنگستانی کتب خانوں میں پہنچا دیں۔ اُن کے مطالعہ نے اس عیسائی فلسفہ کی حیثیت کو طشت از بام کر دیا۔ اس سارے فلسفہ **کلام** کا ماخذ لفظاً لفظاً حتیٰ کہ اُن پولوسی یا کلیسی اصطلاحات تک کا سرچشمہ وہ فلسفہ مانا گیا جو مسیحی ابتدائی صدیوں میں بمقام اسکندریہ دائر و سائر تھا جس کا بانی افلاطوں تھا۔ اسی فلسفہ کی ایک بڑی معلمہ مصری خاتون **ہائی پیشیا** تھی جو ایک عیسائی بشپ کے اشارے سے ۴۱۵ء میں ایک پادری نے قتل کر دی۔ اسی فلسفہ کی کتابیں اسکندریہ کے کتبخانہ میں تھیں۔ جسے اُس بشپ نے جس کا یہ بشپ جانشین تھا ۳۹۰ء میں شہنشاہ **تھی اوڈوسیس** سے اجازت لیکر جلوا دیا۔ کتابیں تو اب بھی بہت سی ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف ایک مصنف کو لیتا ہوں جن کا نام حکیم **فائیلو** ہے۔ یہ اسرائیلی فلسفی بہت سی کتابوں کا مصنف ہے۔ یہ اپنے وقت کا ایک مقتدر انسان تھا۔ بلکہ ایک دفعہ یہودیان اسکندریہ کی طرف سے سفیر ہو کر **کیلی گیولا** قیصر روم کے دربار میں بھی گیا تھا مسیح کی پیدائش

سے ایک ہی نسل پہلے پیدا ہوا تھا میں اُس کی تصانیف سے چند کتابوں سے ذیل کے اقتباس لیتا ہوں :-

"خدائے ابدی کا ابدی کلام ہی تمام چیزوں کی بنیاد ہے (De Plantatione Noe 1: 331) کلام ہی خدا کی تصویر ہے۔ کل ذی عقل مخلوق سے وہی پہلے پیدا ہوا۔ وہ خدائے واحد کے ساتھ بغیر کسی فرق کے بیٹھا ہوا ہے (De Peofagis, 1: 561, 16) وہی اُس کا پہلوٹھا بیٹا ہے (De Agric, 1: 308) خالق کائنات نے اپنے **کلام** کو جو آسمان میں سب سے قدیم و اعلیٰ ہے یہ عزت دی کہ وہ خالق و مخلوق میں سفارشی یا شفیع ٹھہرا (Quis Rerum Divin Hares, 1: 501) لہذا **کلام** ہی تمام فانی چیزوں کے لئے (خدا کے آگے) **وکیل** ہے (Ibid 502) وہی کلام انسان کا جو ہمیشہ گناہ کرتا ہے **شفیع** ہے۔ کلام ہی خدا کا انسان کی طرف جو اُس کا ماتحت ہے **رسُول** ہے۔ وہی (کلام) سب چیزوں پر حکمران ہے (Ibid, 501) کون ذی فہم انسان ہے جو عامتہ الناس کے اعمال دیکھ کر خدائے **نجات دہندہ** کو مخاطب کرکے یہ نہ پکار اُٹھے کہ وہی (خدا) گناہ کے بوجھ اُٹھائے اور روح (خاطی) کی **قیمت یا تاوان** دیکر اُس روح (خاطی) کو از سرنو اصلی (بے لوث) حیثیت تک پہنچائے (De Confus Ling., 1: 418) اس لئے خداوند ہر ایک انسان کو تاکید کرتا ہے کہ وہ زندگی کی

دوڑیں ربانی **کلام** کے مطابق۔ بلاکم وکاست اپنا راستہ تجویز کرے۔ کلام ہی تمام حکمت کا سرچشمہ ہے۔ اسی مقدس چشمہ سے پانی پی کر انسان **موت کی جگہ حیاتِ ابدی** پاتا ہے (De Profugis, 1:560, 31) ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کلام ہی بڑا **کاہن** ہے۔ وہ بالارادہ وبلاارادہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہے۔ کیونکہ وہ **آسمانی پیدائش** سے ہے (Ibid, 1:562, 13) خدا کا کلام طبیب اور تمام آزاروں سے **نجات دہندہ** ہے (De Leg. Alleg, 1:122, 17) اگرچہ ہر ایک شخص خدا کا فرزند کہلانے کے قابل نہیں تاہم اُسے اپنے حالات کی ایسی اصلاح کرنی چاہیئے۔ کہ خداوند کے پہلوٹھے بیٹے (کلام کے حالات) کے مطابق اُس کے حالات ہو جائیں۔ کلام فرشتوں سے بھی پہلے پیدا ہوا۔ اُس کے (کلام کے) بہت نام ہیں (مثلاً) **حکم۔ خدا کا نام۔ کلام۔ انسان کی تصویر** (De Confu. Ling, 1: 427) خدا اُسی کلام کے ذریعہ جس سے اُس نے ہر ایک چیز کو بنایا۔ نیک انسانوں کو پستی سے اُٹھا کر اپنے قرب میں لے آئیگا (De Sacrificis, 1: 165, 5.) خدا کے تمام کام کامل اور غلطی سے منزہ ہیں۔ خداوند نے اپنے پہلوٹھے یعنی کلام کو اسی طرح اپنے مقدس گلّے کی حفاظت کے لئے مقرر کیا ہے جس طرح کوئی طاقتور بادشاہ اپنا **نائب** مقرر کرتا ہے۔ (De Agrie, 1: 308)

مقدس کلام جو بڑا **کاہن** اور خدا کا **پہلوٹھا** ہے (De Somnis, 1: 653) وہی اُس کے مقدس گلے کا **گڈریا** ہے (De Agric, 1: 308) وہ (کلام) انسان کی شکل میں (De Confu Ling, 1: 427) خدا کا **ترجمان** ہے - (De Legis Allegor., III. 73) جس طرح انسان سورج کو تو نہیں دیکھ سکتا - لیکن اُس کے انعکاس کو ہی سورج سمجھتا ہے - اسی طرح خدا کا کلام بھی جو اُسی کی **تصویر** ہے - **خدا** سمجھا گیا (De Somn, 1: 40, 41) ربانی کلام جو سب سے پہلے پیدا ہوا - وہی آسمانی غذا ہے - وہی **روٹی** ہے یعنی روح انسانی کے لئے خدا کی مقرر کردہ غذا ہے (De Leg-Alleg, 1: 120, 34 De Deler Potiori Infid, 1, 213-45) خدا کے اِدھر اُدھر دو اعلیٰ ہستیاں ہیں جن کے صفات نیکی اور قدرت ہیں - اور اُن کے درمیان الوہیت ہے - اور وہ (خدا) اُن کے ساتھ متحد ہے (De Sacrificiis, 1: 173, 12) **کلام - مقدس - بڑا کاہن** بالارادہ یا بلا ارادہ گناہوں سے پاک ہے - اسی لئے اس کا سر **ممسوح** ہوا (De Somniis, 1: 653) یقینی اور قابل اعتبار باثبات نعمت **ایمان** ہی ہے (De Abrahamo, II: 38) ہر ایک انسان کے لئے جو **باپ** کے احکام بجا لاتا ہے ضروری ہے کہ وہ اُس کے بیٹے کے پاس جو **کیبل**

ہے۔جائے۔تاکہ اُس (انسان) کے گناہ بخشے جائیں۔اور ہر قسم کی نیکی حاصل کر سکے۔ (De Excecrationibus, 11: 435, 29) اسی قسم کے انسان نجات دہندے اور رحیم خدا سے نجات حاصل کرینگے۔اور **کلام** کے مطابق اپنے حالات کر کے نہایت برگزیدہ اور اعلیٰ فائدہ حاصل کرینگے (Ibid, 11: 4 35) کلام ہی دُنیا کی روشنی ہے (De Somniis, 106: 41) خدا کا قائم مقام ہے (De leg Alleg, 1: 129, 7 + "De Somnios, 1: 656, 48) اور اُس کا **پیارا بیٹا** ہے

عیسائی دوستو! میں آپ سے راستی۔صداقت۔امانت۔دیانت بے تعصبی اور سب کے بعد خدائے قدوس کے نام پر اپیل کرتا ہوں۔کہ وہ کونسا عقیدہ۔یا کونسا فلسفہ یا کونسی الہیات یا کونسی اصطلاح پولوس یا اُسکے ہمنواؤں نے یا بحیثیت مجموعی عیسوی کلیسیا نے تعلیم کی ہے جس کا چرچا قدیم سے آج تک مسیحی گرجوں۔مسیحی عبادتوں سرمنوں (وعظوں) میں مسیحی منادوں کی زبان پر۔اور مسیحی پلیٹ فارموں (ممبروں) سے ہو رہا ہے اور وہ مندرجہ بالا اقتباسات میں موجود نہیں۔یہاں تو کسی تکلیف اور ہیر پھیر کی ضرورت نہیں۔صاف صاف الفاظ میں **کلام** کے متعلق حکیم موصوف (فائیلو) نے وہی عقائد اور وہی باتیں بیان کی ہیں۔جو مسیحی کلیسیا کی روح رواں ہیں میں مسیحی مصطلحات کو چھوڑ کر ذیل میں برعایت اختصار مسیحی عقیدہ کو لکھ دیتا ہوں۔آدم صحیح فطرت لے کر پیدا ہوا۔

آدم کی غلطی سے انسانی فطرت میں خرابی واقع ہوئی۔ وہ اس خرابی سے اپنے اعمال کے ذریعہ نکل نہیں سکتا۔ اُس کے (آدم کے) اعمال خدا کے فضل کے سوا ہیچ ہیں۔ اُس کی نجات اُسی کے ذریعہ ہوسکتی ہے جو آسمانی پیدائش لے کر زمین پر آیا۔ وہ وہی خدا کا **کلام** ہے جو اُس کا پہلوٹھا کہلایا۔ وہی ابدی ہے۔ وہی گناہوں سے پاک اور اس لئے وہی خدا کے ہاں انسانوں کا سفارشی اور شفیع ہے۔ وہی اس کا نجات دہندہ ہے۔ اُسی کے ذریعہ انسان گناہ سے مخلصی پاکر حیات ابدی حاصل کرتا ہے۔ اور اپنی اصلی فطرت کو پالیتا ہے یعنی پُرانا آدم مرکر نیا آدم پیدا ہوجاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ الغرض اس عقیدہ میں ایک بھی بات نہیں جو حکیم موصوف کے (فائیلو کے) معتقدات میں نہ آگئی ہو۔ اب اس مسیحی فلسفہ کے ساتھ مسئلہ کفارہ یعنی خدا کا انسانی گناہوں کے اُٹھانے کے واسطے زمین پر آنا (اور یہ بات بھی حکیم موصوف ہی کی ہے) اور داستان صلیب۔ پھر جی اُٹھنے کی کہانی۔ اور آسمان پر چڑھ جانا۔ وہ کونسی بات اب باقی رہ گئی ہے جسے ہم الٰہی الہام کی طرف منسوب کریں۔ حتیٰ کہ ایک قسم کی تثلیث تو حکیم **فائیلو** نے بیان کردی ہے۔ گذشتہ صفحات میں بھی ایک تثلیث کا ذکر کر آیا ہوں۔ یعنی برس کی تین کیفیات یعنی برس کا پیدا ہونا۔ اُس کا مرنا۔ اُس کا پھر جی اُٹھنا۔ اور اُس جی اُٹھنے کے ساتھ کل دنیا کو نئی زندگی بخشنا۔ یہ تو ایک قدیمی یونانی بُت پرستی کا عقیدہ تھا۔ مگر فیثاغورس نے ایک اور تثلیث کا پتہ دیا ہے جس کو قدیم سے کل یونانی

حکماء نے تسلیم کیا ہوا تھا۔ اُس تثلیث کے تین **اقنوم** تھے (۱) خدا (۲) روح کائنات (۳) روح انسانی۔ یہ بھی دراصل اُسی مسئلہ کلام تعلیم وادہ افلاطوں کی دوسری شکل ہے۔ مگر حقیقت ایک ہی ہے۔ اور حقیقت حقہ ہے۔ جسے مَیں آگے چل کر بیان کرونگا۔ لیکن مشرکانہ فطرت نے کہیں اُسے بُت پرستی کے رنگ میں دیکھا۔ اور کہیں اُسے مسیحیت کی شکل دیدی حکیم **پلیوٹارک** ہمیں ایک اَور تثلیث کا حوالہ دیتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ جناب **زرتشت** نے تجویز کی تھی۔ اُس کے بھی تین اقانیم تھے (۱) باپ (ایزد) جس سے کل دنیا نکلی (۲) متھرا (سورج) اور (۳) کائنات۔ یہ بات بھی صحیح ہے۔ اگر روحانی نظام میں فلسفہ کلام اپنے اصلی معنوں میں جیسا میں آگے چل کر بیان کرونگا صحیح ہے۔ تو جسمانی نظام میں حضرت زرتشت کی مجوزہ تثلیث بھی درست ہے۔ نظام شمسی کی کل کائنات جو انسانی نگاہ میں ہے۔ وہ سورج ہی سے نکلی ہے۔ گویا سورج ہی وہ چیز ہے جس کو جسمانیات میں خدا تعالےٰ نے سب سے اول پیدا کیا ہے۔ پھر اسی سے کل کائنات بنی۔ لہذا بالفاظ استعارہ۔ اگر خدا سب کا **باپ** ہے۔ تو اس کا پہلوٹھا بیٹا متھرا (سورج) ہے۔ "ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اب اگر ایک مشرک نگاہ، نیر اعظم ہی کو اپنا خدا اور رب مان لے تو کوئی عجب بات نہیں لہذا انجیل یوحنا کی پہلی چند آیات مسیح یا کسی انسان پر تو مطلقاً

نہیں مگر سورج پر ہر معنوں میں ایک مشرکانہ خیال سے صحیح طور پر چسپاں ہوتی ہیں +

"ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"+

انجیل یوحنا میں جس یونانی لفظ کا ترجمہ لفظ کلام کیا گیا ہے۔ وہ لفظ **لوگس** ہے۔ اس کے معنی صرف کلام ہی نہیں۔ بلکہ **خیال** اور اس کا اظہار۔ یعنی کلام اور مفہوم کلام۔ مَیں نے حکیم **فائیلو** کے ترجمہ اقتباسات بالا میں اگر لفظ کلام استعمال کیا ہے۔ تو صرف انجیلی ترجمہ کی رعایت سے کیا ہے۔ ورنہ حکیم موصوف کی تصنیف میں لفظ **لوگس** ہی آیا ہے۔ لفظ لوگس سے اُن کی مراد عقل یا ارادہ ہے۔ یہ مسئلہ دراصل پیدائش کائنات کے متعلق حکیم **افلاطون** کا نظریہ ہے۔ جسے حکمائے اسلام نے **عقل اوّل** سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی خدائے تعالیٰ کا وہ ارادہ ازلی جس میں کل کائنات کا ظہور اور اُس کی ترتیب تھی۔ اور جس کے ماتحت یا مطابق کل دنیا پیدا ہوئی۔ اس امر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ظہور کائنات سے پہلے ارادۂ الٰہی کا وجود ہوگا۔ وہی ارادہ سب سے پہلے پیدا ہوا۔ اُسی سے ہر ایک چیز پیدا ہوئی۔ اُسی کا جلوہ ذرّہ ذرّہ میں ہے ۔ انسان یا کوئی مخلوق جب تک اپنے حالات اُسی ارادۂ ازلی کے مطابق نہ کرلے ۔ فلاح نہیں پا سکتا

لہذا وہی ازلی ارادہ بعبارت استعارہ خدا کا پہلوٹھا ہے۔ خدا کی طرف سے مخلوق پر حکمران ہے۔ اُسی سے کل دُنیا بنی۔ جو کچھ دنیا میں ہے اُسی کے وسیلے سے ہے۔ وہی دنیا کی روشنی ہے۔ وہی دنیا کا منجی ہے۔ وہی خدا کا ترجمان ہے۔ یعنی ذات ازلی کا مظہر اول اور مظہر کل۔ الغرض وہ ساری باتیں جو حکیم **افلاطون** نے عقل اول کے متعلق۔ **فائیلو** نے لوگس کے متعلق۔ یوحنا نے کلام کے متعلق اور کلیسیا نے مسیح کے متعلق کہیں۔ وہ باتیں عقل اول۔ لوگس۔ کلام۔ مسیح پر منطبق ہوں یا نہ ہوں لیکن **ارادہ ازلی** ان سب پر حاوی ہے۔ دراصل خود حکیم افلاطون پر بھی یہ حقیقت بیّن طور سے ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی خود کسی چیز کے نقش ذہنی اور اس کے خارجی ہونے کے چکر میں سرگردان رہا۔ معہود فی الذہن یا وجود خارج از ذہن کے نظریئے اُسمیں اور اُس کے شاگرد ارسطو میں باعث اختلاف ہوئے ان ذہنی پیچیدگیوں نے مسئلہ **ارادہ ازلی** کو بیّن طریق پر سمجھنے سے افلاطون کو قاصر رکھا۔ کچھ اُس کی کم و بیش مشرکانہ طبیعت بھی اصل حقیقت کے سمجھنے سے مانع ہوئی کیونکہ وہ زمانہ شرک ہی کا تھا۔ ان لوگوں کو اول تو حقائق بھی مشرکانہ رنگ میں نظر آرہے تھے اور اگر صفائی دماغ نے حقائق کو اصلی رنگ میں دیکھ بھی لیا۔ تو جس زبان میں اظہار کرنا تھا وہ مشرکانہ تھی۔ اُن کا مقصد خواہ کچھ ہی ہو۔ اُن کے کلام کو پڑھنے یا سننے والے سب کے سب مشرک ہی تھے۔ وہ ان کے خیالات کو تصویر یا ہیئت کی شکل میں ظاہر کرتے تھے۔ ان

حکماء نے تو اُس حقیقت **ارادہ ازلی** کا نام پہلوٹھا بیٹا۔ دنیا کی روشنی۔ مخلوق کا سبب خلق۔ ازلی وابدی وغیرہ وغیرہ رکھا جن سے اُن کی مراد صرف اظہار مقصد تھی۔ لیکن عوام نے ان نظریوں کو انسانی لباس پہنایا۔ بُت بنائے۔ مصوری کے تمام فنون خرچ کر دئے۔ ایک حد تک یہ بھی درست تھا۔ اگر حقیقت سامنے رہتی۔ اور یہ تصویریں اور مجسمے فقط **تشریح** سمجھے جاتے۔ لیکن آنے والی نسلیں حقیقت سے الگ ہو کر ان مجسموں اور تصویروں کی پرستار ہو گئیں۔ ہندوستان کا بھی یہی حال ہوا۔ مغرب میں اسی مشرکانہ فطرت نے قدیمی حقائق حکیمانہ کو چوتھی یا پانچویں صدی پر مسیح کی صورت میں پیش کیا۔ یہی زمانہ ہندوستان میں **پرانوں** کا زمانہ ہے۔ آج قریباً ڈیڑھ ہزار برس کے بعد ہندو تعلیم یافتہ اصحاب تو بُت پرستی میں ان حقائق بالا کو دکھاتے ہیں۔ وید کے معنی کرنے میں عناصر کے معانی صفات الہیہ کرتے ہیں۔ یہ سب صحیح۔ لیکن وہ خدا جس کی منشا کو اس طرح شرک اور بُت پرستی میں تبدیل کر دیا گیا۔ کیونکہ کروڑ در کروڑ ہندو عیسائی پارسی ان تعلیم یافتہ اصحاب کی تشریحات کے قائل نہیں۔ اور ابھی تک اُسی بُت پرستی اور شرک میں مگن ہیں۔ وہ خدا کیوں ان انسانی تشریحات کا محتاج ہو۔ اور عین وقت پر حقیقت حال ظاہر نہ کرے۔ اگر ابتدا میں اُس نے یہ حقائق تعلیم کئے۔ تو جب اور جہاں بھی یہ حقائق شرک کے پردہ میں چھپ جائیں تو اُسی کا فرض ہے کہ نئے الہام کے ذریعے سے زمانہ کو

پیدا شدہ غلطیوں سے پاک کرے۔ چنانچہ قرآن شریف کا یہی مذہب ہے۔ انبیا بھی وقتاً فوقتاً
اسی غرض کے لئے آئے۔ پھر سب کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کاملہ
بھی اسی غرض سے ہوئی ۔ اس مسئلہ زیر بحث کو جس سے ہندوستان۔ ایران۔ یونان۔
روما اور اُن کے بعد کل مغرب شرک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قرآن نے کیسے واضح الفاظ میں
صاف کر دیا ہے۔ فرمایا۔ اذا اراد شئ ان یقول لہ کن فیکون۔ یعنی جب اللہ تعالےٰ
کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو کہہ دیتا ہے کہ ہو پس وہ ہو جاتی ہے۔ اب اس حقیقت کا
نام کچھ رکھو۔ اس آیت نے تو اُن پیچیدگیوں کو بھی صاف کر دیا ہے جس میں افلاطون
پھنسا ہوا تھا۔ اس آیت نے ارادہ۔ اظہارِ ارادہ اور ظہورِ ارادہ کو الگ الگ بیان
کر کے اور سب کا فاعل ذات باری کو بتا کر اس مسئلہ کو نیچے سے نیچے کے لئے بھی
عام فہم کر دیا +

فتدبروا یا اولی الالباب۔

مسیحی کلیسا کے معمار

خشتِ اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

میں نے اپنی طبیعت کے خلاف تاریخ و حالاتِ کلیسا سے مجبور ہو کر اس باب کی افتتاح اس شعر سے کی ہے۔ کیونکہ اس شعر سے اس کلیسا کی کل کی کل حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے۔ جو غلطی سے مسیح کے نام پر مشہور کیا گیا ہے مسیح جیسے راستباز اور شریعت پر مُصر اور اس کے پابند انسان کو جس کا ایک بھاری مشن منافقت کو فنا کرنا تھا۔ ایسی تعلیمات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جس کی پہلی بنیاد **پولوس** جیسے انسان نے ڈالی۔ پولوس کے دل و دماغ اور اس کی نیّت کی کیفیت کے اظہار کے لئے اس کا ایک ہی مقولہ کافی ہے۔ کتاب اعمال سے لے کر آخر تک کل پولوسی صحائف پڑھ جاؤ اس کے مختلف قول و فعل میں اسی مقولہ کے جلوے نظر آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"میں یہودیوں کے لئے یہودی بنا۔ تاکہ یہودیوں کو کھینچ لاؤں۔ جو لوگ شریعت کے ماتحت ہیں اُن کے لئے میں شریعت کے ماتحت بنا اگرچہ

خود شریعت کے ماتحت نہ تھا۔ اور بے شرع لوگوں کے لئے بے شرع بنا۔ تاکہ بے شرع لوگوں کو کھینچ لاؤں کمزوروں کے لئے کمزور بنا۔ تاکہ کمزوروں کو کھینچ لاؤں میں سب آدمیوں کیلئے سب کچھ بنا ہوا ہوں تاکہ کسی طرح سے بعض کو بچاؤں اور میں سب کچھ انجیل کی خاطر کرتا ہوں تاکہ اوروں کے ساتھ اس میں شامل ہوں"۔

آج اگر مغرب کے فضلائے مسیحیت اس کلیسا سے الگ ہو گئے جسے ان فقرات کے بولنے والے انسان اور اُسکے متبعین نے تیار کیا تو انہوں نے اپنی دیانت و امانت کا ثبوت دیا ہے۔ آج اگر اسقف اعظم آرچ بشپ پارک نے جرأت سے یہ کہا ہے کہ ہمارا کلیسا **نفرت انگیز** ہے۔ تو اس نے حقیقت کا ہی اظہار کیا ہے۔ میرا دل تاریخ کلیسا پڑھ کر خون ہو جاتا ہے۔ ایسے مذہب کے لئے جسے مسیحؑ سے کوئی تعلق نہ ہو جیسے کہ آج فضلائے مسیحیت نے مان لیا۔ اور جس کی ترمیم و تنسیخ ہر وقت ضرورت زمانہ یا وقتی متداشرہ خیالات کے مطابق ہوتی رہی ہو۔ خواہ وہ خیالات غلط ہوں یا صحیح۔ کروڑہا انسان گذشتہ پندرہ صدیوں میں حوالہ کشت و خون ہوں۔ علم و فضل کا قلع قمع کیا جائے۔ ہر تحریک تہذیب و تمدن کو دبایا جائے۔ اور پھر اسی مذہب پر آج کروڑوں پونڈ پانی کی طرح بہائے جا رہے ہیں۔ کس قدر ظلم ہے۔ کہ جس مذہب کو جس کلیسا کو یہ اہل مغرب خود چھوڑتے ہیں۔ اُس کے جوئے کے تلے مشرق کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر اس کام کے کرنے والے اور

اس میں امداد دینے والے وہ لوگ جو خود اس سے متنفر۔ کتاب کو تو خود محرف و مشتبہ اس کے بعض حصص کو داستان اکاذیب قرار دیں۔ اُس کی صحت پر حلف لینے سے اُن کے بڑے پادری **کنٹربری** کے جلسہ عام میں انکار کریں اور اسی غرض سے **مقررہ حلف** کلیسا کو بدل دیں۔ پھر اسی کتاب کو کروڑوں کی تعداد میں چھاپ کر دُنیا میں شائع کریں۔ خود تو مختلف کونسلیں کر کے اس فکر میں لگ جائیں کہ پُرانے عقائد کی جگہ نئے عقائد تجویز ہوں۔ اور گذشتہ ۲۲۔ جولائی ۲۳ئہ کو برسٹل میں بصدارت آرچ بشپ کنٹربری اس لئے جمع ہوں۔ کہ کس طرح عیسائیوں کو عیسائی رکھا جائے کس طرح خالی شدہ گرجوں کو معمور کیا جائے لیکن اُسی جلسہ میں ہمارے متعلق یہ کہا جائے کہ آج اسلام کے پچاس بڑے شہروں میں سے چالیس شہر ہمارے حلقۂ اثر میں ہیں۔ اور اسلام عیسائیت کے لئے نوتوڑ زمین ہے ؛

پولوس نے خود جناب مسیح سے کوئی فیض نہیں پایا۔ اُن کی مسیح کی زندگی میں وہ اُن کا ایک جانی دشمن تھا۔ اُن کی ایذا رسانی میں اُس نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ جناب مسیح کے بعد وہ حواریوں کے پاس آتا ہے۔ اور ایک رویا کا قصہ سناتا ہے۔ اپنے آپ کو مسیح کا خادم ظاہر کر کے یہودا سکریوطی کی خالی شدہ جگہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے میں اس کی نیت پر حملہ نہیں کرتا۔ اُس کے اعمال ہی اس کو ظاہر کر دیتے ہیں جو کچھ یہودا سکریوطی

نے مسیحؑ کے ساتھ زندگی میں کیا وہی اُس کے جانشین پولوس نے آپ کے بعد آپ کے
مذہب کے ساتھ کیا۔ پولوس جس جماعت کو چھوڑ کر مسیح کے مریدوں میں آملا تھا۔ وہ اُس
کی طبعاً دشمن ہوگئی۔ یہودی اس کو نفرت سے دیکھنے لگے۔ پولوس کے لئے اَور کوئی چارہ
نہ تھا۔ کہ مختونوں کو چھوڑ کر وہ غیر مختونوں یعنی یونانیوں۔ رومیوں میں اپنی جگہ بنائے۔ وہ
لوگ نہ شریعت کے پابند نہ شرعی احکام سے تعلق رکھنے والے۔ جو سامنے آجائے۔ کھا
جانے والے۔ خنزیر کا گوشت ہو یا چڑھاوے کا گوشت۔ پولوس نے یہ سب جائز کر
دیا۔ شریعت کے احکام توڑ دئے۔ وہ مجبور تھا۔ کیونکہ یونانی قیود شرعیہ قبول نہ کر سکتے تھے
سب سے بڑھ کر وہ غیر مختونوں کو مسیحی مذہب میں لا ہی نہ سکتا تھا مسیحؑ کی تعلیم اُس کا
عمل اُس کے خلاف تھا۔ پولوس کی ان حرکات سے حواری گھبرائے۔ اُس کو ان باتوں
سے روکا۔ مگر وہ کب رُکنے والا تھا۔ اُنہیں گول مول جوابدیا۔ آخرکار بصد اصرار یہودیہ میں
آیا۔ ایک مجلس اس لئے قائم ہوئی۔ کہ پولوس اپنی صفائی پیش کرے۔ فریسی اور صدوقی
فقیہ بھی جمع ہوئے۔ وہ لوگ پولوس سے کچھ ایسے متنفر تھے۔ کہ اُس کی شکل دیکھتے ہی بعض
فریسی شور و غل کرنے لگے۔ پولوس تو ایک موقعہ شناس انسان تھا۔ ایک شوشہ چھوڑ کر
فریسی اور صدوقیوں میں فساد ڈلوادیا۔ اور آپ چلتا بنا۔ اس واقعہ کے بعد پولوس کا
میدان عمل زیادہ تر یونانی اور رومیوں میں ہی محدود ہوگیا جن کی روایات عقائد۔ خیالات

اور طرزِ عمل کے مطابق پولوس نے مسیح کے نام پر ایک نیا مذہب تیار کر دیا۔ اور اس کے رفقا اگر اس نتیجہ پر آگئے کہ مسیح کے نام پر جو کلیسیا آج قائم ہے۔ وہ بنا کردہ مسیح نہیں۔ تو ایک صحیح نتیجہ ہے ٭

میرے نزدیک تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ کلیسیا پولوس کا بنایا ہوا ہے۔ ابتدائی صدیوں میں معلمانِ کلیسیا کا یہ ایک مسلمہ طریق تھا۔ کہ جب کوئی نئی بات بنائی۔ یا وقتی ضرورت کے دفعیہ کے لئے کوئی نیا مسئلہ ایجاد کیا۔ تو اُسے ایک کتاب یا صحیفہ کی شکل میں لکھ کر کسی متقدر معروف نام پر شائع کر دیا۔ پولوسی تصانیف کی حقیقت آج یہی مانی جاتی ہے لیکن ہمیں اس سے بھی بحث نہیں۔ پولوس ہو یا کوئی اَور راہب ان سب نے پولوس کے اقوال مندرجہ بالا پر عمل کیا۔ "کہ مَیں بے شرع لوگوں کے لئے بے شرع بنا۔ تاکہ بے شرع لوگوں کو کھینچ لاؤں مَیں کمزوروں کے لئے کمزور بنا . . . . . مَیں سب آدمیوں کے لئے سب کچھ بنا ہوا ہوں . . . مَیں سب کچھ انجیل کی خاطر کرتا ہوں"۔ ان الفاظ کا صاف اَور موٹے الفاظ میں ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ میرا نہ کسی مذہب سے تعلق ہے۔ نہ کسی شریعت کی پابندی ہے۔ نہ کسی کمزوری کی مجھ کو پرواہ ہے۔ غرض مسیح کو منوانا ہے خواہ کسی طرح سے ہو٭

خشتِ اول چوں نہد معمار کج ۔۔۔۔ تا ثریا می رود دیوار کج

یہی وہ خشتِ اول ہے جو کج رکھی گئی۔ اور وہ یہ تھی کہ مسیحی مذہب کو ہر دلعزیز کرنے

کے لئے یا اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کے لئے مسیحؑ کے نام پر ہر ایک عقیدہ مقبولہ یا روایات متداثرہ کو خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط کلیسیا میں داخل کرلیا جائے۔ اسی پر ہر آنے والی راہبوں کی نسل نے عمل کیا **نیقیہ** کی کونسل نے **انطونوشیا** نے۔ **شاہ قسطنطین** غرض سب نے یہی طریق اختیار کیا۔ آج بھی علی الاعلان یہی ہو رہا ہے پرانے مشکیزہ میں نئی شراب بھری جارہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پرانے معماران کلیسیا تو کسی قدیم مقتدر نام پر نئی عمارت کھڑی کرتے تھے۔ آج کل کے معماروں کی دیانت نے اُنہیں اس بات پر مجبور کیا۔ کہ پرانی عمارت کو علی الاعلان بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر اُس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کردیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر مذہب خدا کی طرف سے ہے اور اُسی کا بنایا ہوا ہے تو انسانی ہاتھ ربانی عمارت کو نہیں بنا سکتے۔ اگر خدا تعالےٰ نے ہر ایک ضرورت کے وقت ربانی ہیکل (مذہب حقہ) کی شکست وریخت کو اپنے معماروں (انبیاء) کے ہاتھوں درست کرایا۔ تو جس بگڑی ہوئی ہیکل کو مسیحؑ درست کر کے چھوڑ گیا تھا۔ اور وہ پانچویں چھٹی صدی میں بالکل برباد ہو چکی تھی۔ اس کی درستی کے لئے عین اُسی وقت کیوں کوئی ربانی معمار نہ آتا۔ خدا نے اپنی سنت قدیمہ کے مطابق نبوت کی اُس آخری **اینٹ** کو بھیجا جس نے عمارتِ مذہب کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کردیا۔ آج جن جن عقائد کو چھوڑا گیا ہے اور غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ سب کے سب پانچویں چھٹی صدی میں پیدا ہو

چکے تھے۔ پھر ان باتوں کو چھوڑ کر ان کی جگہ جو مذہب تجویز ہو رہا ہے۔ اس کی بہترین شکل اسلام ہے چھٹی صدی میں خاتم النبیین حضرت محمد صلعم نے وحی الٰہی کے ماتحت مبعوث ہو کر مسیحی عقائد کے متعلق وہی کہا۔ جو آج تیرہ سو برس بعد فضلائے مسیحیت کہتے ہیں۔ اور دنیا کو ایک بہتر سے بہتر مذہب دے گئے۔ لیکن مشکل تو یہ آن پڑی کہ عیسائیت آج صرف مذہب ہی نہیں بلکہ اس کے نام تلے مغربی اقوام کی بہت سی سیاسی اغراض کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس لئے نام تو عیسائیت ہی رکھا جائیگا۔ گو اس نام تلے کل اسلامی تعلیم آجائے۔ نماز کی صورت تو وہی رہیگی گو تحمید و تسبیح اسلامی ہو جائے ۔

جس وقت عیسائی مذہب کا مغرب میں ظہور ہونے لگا۔ اس وقت بحیرہ روم ایک جھیل کی صورت تھا جس کے ارد گرد کے متمدنہ ممالک میں ایک ہی مذہب مختلف شکلوں اور ناموں میں دائر و سائر تھا۔ یہ مذہب۔ مذہب شمس پرستی تھا۔ **منتھر ا۔ بعل۔ اطیس۔ بیکس۔ ایڈونس۔ ہرکلیس۔ اپالو۔ ہورس۔ آسیرس** یہ سب کے سب سورج دیوتا ہی کے نام تھے۔ ان سب کی پیدائش کنواری کے ہی بطن سے ۲۵ سے لیکر ۲۹ دسمبر کی کسی تاریخ کو مانی ہوئی تھی۔ ان کی ذات کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں بارہ کے عدد کا تعلق تھا بعض کے بارہ شاگرد یا دوست۔ بعض کے بارہ کارنامے بعض کی بارہ سفرگاہیں دبروج) تھیں۔ ان کی زندگیاں کل کی کل نسل انسانی کے فائدہ اور اس

کی نجات میں گذریں۔ ان سب نے انسانی نجات اپنی موت سے کی چنانچہ وہ مصلوب یا مقتول ہوئے۔ تاریخ موت بھی وہی اخیر مارچ یا **گڈ فرائی ڈے** کے قریب قریب ہے۔ اُن میں سے اکثر قبر میں بھی وہی دن رہ کر بعد میں جی اُٹھتے ہیں۔ جی اُٹھنے کا دن بھی وہی **ایسٹر** کا دن ہے۔ ان باتوں کو مَیں تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر بیان کر آیا ہوں۔ یہاں تو مَیں نے استحضاراً ان باتوں کا پھر ذکر کیا ہے۔ ہاں! عیسائی دوست اس ایک بات پر ہی غور کریں کہ **گڈ فرائی ڈے یا ایسٹر سنڈے** کیوں ایک تاریخ پر ہر سال نہیں آتے کیوں ان تاریخوں کی تعیین قمری گردش کے ماتحت ۔ ۔ ۔ ۔ رکھی گئی ہے۔ یہ تو وہی موسم بہار کی کیفیات ہیں۔ وہی مری ہوئی زمین کے جی اُٹھنے کی تاریخ ہے جس کے ساتھ کل دُنیا دوبارہ زندہ ہوتی ہے جس واقعہ کے ساتھ اگر آفتاب کو تعلق ہے۔ تو ماہتاب کو بھی اُس سے کم تعلق نہیں ؞

ایک طرف تو ولادتگاہ مسیح کے ارد گرد ممالک میں یہ عقائد پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُن سب مذاہب میں سے جو در اصل ایک ہی مذہب کی مختلف شکلیں تھیں **متھرا مذہب** اُس وقت سب پر غالب تھا۔ اُس کے نام پر **بپتسمہ** اور **عشاء ربانی** کی رسم بھی قبل از مسیح صدیوں پہلے ادا ہوتی تھی۔ دوسری طرف فلسفی دُنیا میں مسئلہ کلام (**لوگس**) مرغوب تھا جس کی تشریح مَیں بیان کر چکا ہوں تیسری طرف یہودی مذہب تھا جس کے

پرستار قریب قریب ہر متذکرہ بالا ممالک میں موجود تھے۔ الغرض مذہب اور فلسفہ کی یہ تین نہریں بحیرہ روم کے ارد گرد کے ملکوں میں جاری تھیں۔ معماران مسیحی کلیسیا نے اپنی کامیابی اسی میں دیکھی کہ ان تینوں مذاہب میں سے کچھ کچھ مصالح لے کر ایک مذہب کی عمارت تیار کر لی جائے جس میں ان ہر سہ.... جماعتوں کے معتقدات کا لحاظ رہے۔ یہودیوں کو تو یہ کہا گیا۔ کہ جس اسرائیلی قوم کے منجی اور ابن داؤد کے تم منتظر تھے۔ وہ یہی **ابن مریم** ہے اس ایک بات کے سوا باقی کل یہودی مذہب کو قریب قریب چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ شریعت کی پابندی باقی کل اقوام کے مذاق کے مطابق نہ تھی۔ وہ تو ہر قسم کی قیود شریعت سے آزاد تھے اور یہودی کل کے کل مرہون شریعت تھے۔ دوسری طرف **متھرا** پرستی کی ہر ایک چیز مذہب میں داخل کر لی گئی در اصل وہی تعلیم مسیح کی قائم مقام ٹھہری حتیٰ کہ مسیح کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔ قسطنطین اور اس کے ہمنواؤں نے مسیح کو **متھرا** یا اُس کے جانشین **اپالو** کی کرسی پر بٹھا کر شمسیت کی کل کی کل روایات اور رسمیات مسیح کے نام پر منتقل کر دیں۔ فلسفی مزاجوں کے مذاق کو صرف اسی طرح پورا کر دیا کہ "لوگس" کا سارے کا سارا فلسفہ لے کر **کلام** کا مجسمہ مسیح کو بنا دیا +

شاہ قسطنطین کے سامنے تبدیلیٔ مذہب کی جو ایک خاص پولیٹیکل غرض تھی وہ قریب قریب دو تین نسلوں سے ہر ایک قیصر روم کے مد نظر رہی۔ رومی سلطنت کے ماتحت مختلف قومیں

تھیں۔ جن کے مذہب ورسم وخیال ایک دوسرے سے جداگانہ تھے۔ قیصران روم اس فکر میں
ہمیشہ سے رہے کہ اُن کی کل کی کل رعایا مذہبی معاملات میں بھی ایک قسم کی یکرنگی اختیار کرلے
چنانچہ وہ اپنی رعایا کے مذہبی نکتہ سے آگاہ ہوئے اور مختلف مذاہب میں مذہبی ہم آہنگی
پیدا کرنے کی کوشش میں رہے۔ رومی سلطنت ہر ایک مذہب کے معبود کے لئے سرکاری
خرچ پر مندر بھی بنوا دیا کرتی تھی قیصر **ہیڈرین** اپنے وقت کا ایک ذی علم بادشاہ تھا
وہ نہ صرف اپنی عالمگیر سلطنت کے مذاہب مختلفہ کے اصول سے ہی واقف تھا۔ بلکہ وہ
بعض مذاہب کے فرقہ ہائے باطنیات میں شریک بھی ہوجاتا تھا۔ اسرائیلیوں کے سوا
باقی کل کی کل رعایا دراصل تو سورج پرست ہی تھی لیکن ہر ایک قوم نے اپنے سورج دیوتا کا
نام ایک خاص رکھا ہوا تھا۔ جن کے مندر الگ الگ موجود تھے۔ **ہیڈرین** کے وقت
عیسائی لوگوں کی بھی ایک کافی تعداد ہوچکی تھی۔ **شاہ نیرو** کا ظلم اس جماعت کو دبا نہ سکا
بلکہ اس ظلم کے بعد عیسائی تعداد میں بڑھ گئے۔ اس لئے ہیڈرین کا یہ پختہ خیال تھا۔ کہ" وہ
مسیح کے نام پر ایک مندر بنائے۔ اور مسیح کو رعایا کے دوسرے معبود دیوتاؤں کی فہرست
میں داخل کرے" (ملاحظہ ہو 43 :1 Campidius) ہیڈرین جو بات
خود نہ کرسکا۔ اُسے اُس کے جانشین قسطنطین نے پورا کردیا +

مَیں نہایت ادب اور سچے اخلاص سے (اور اس امر کا شاہد بھی خداتعالےٰ ہے)

عیسائی دوستوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ کلیسیا کے کسی عقیدہ۔ کسی روایت۔ کسی اصطلاح کا نام لیں۔ اور وہ دیکھ لیں کہ ان کا ماخذ شماسیت یا فلسفہ اسکندریہ ہے کہ نہیں ہے اور بالضرور ہے ❖

مَیں مانتا ہوں اگر وہ اسوقت تک عیسائی ہیں تو نہایت نیک نیتی سے اپنے مذہب پر قائم ہیں اُنہوں نے لاعلمی میں جو باتیں صحیح سمجھیں۔ آج اگر وہ اصلی روشنی میں آگئی ہیں۔ اور وہ ایک بُت پرستی کا بقیہ ہیں، تو اُسے چھوڑ دینے میں تامل نہ ہونا چاہئے۔ وہ ان عقائد اور روایات کو چھوڑ کر مسیحؑ کو نہیں چھوڑتے یہ روایات مسیحؑ کی تو نہیں۔ یہ تو **بعل متھرا** اور **اپالو** کی ہیں۔ اگر مغرب میں فضلائے مسیحیت نے نہایت جوانمردی سے ان عقائد کو چھوڑ دیا ہے۔ تو مشرق والوں کو بھی پیروی میں کچھ عذر نہ کرنا چاہئے مسیحؑ ایک سچے مسلم پیغمبر تھے۔ خدا کے پیارے نبی اور ہمارے متبوع۔ وہ اسلام ہی دنیا میں لائے۔ پہاڑی خطبہ کا لفظ لفظ اس پر شاہد ناطق ہے

"یہ نہ سمجھو کہ مَیں شریعت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جبتک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے نہ ٹلیگا۔ جب تک سب پورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑیگا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا

لیکن جو اُن پر عمل کرے گا۔ اور ان کی تعلیم دیگا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔" (متی ب ۵۔ آیت ۱۷ تا ۱۹)

خدا کے احکام یا شریعت پر چلنا ہی اسلام ہے۔ آسمان کی بادشاہت میں بقول مسیح وہی چھوٹا کہلائے گا۔ جو شریعت پر عمل نہ کریگا۔ اور وہی بڑا کہلائے گا جو شریعت پر عمل کریگا یا اُسے سکھائیگا۔ بالفاظ دیگر **مسلم** یا معلم اسلام ہی جنتی ہے۔ جناب مسیح دنیا میں اسلام ہی سکھانے آئے۔ مذہب محبت جو آج مسیح کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ اسلام ہی ہے۔ ہاں! وہ (مسیح) اس مذہب کی پوری تعلیم نہ کر سکے۔ وہ اس مذہب کی شرائع یا حدود بیان نہ کر سکے۔ مذہب حقہ کی علت غائی ہی خدا اور مخلوق سے محبت ہے جناب مسیح نے بھی اس پر زور تو دیا۔ مگر وہ تکمیل تعلیم نہ کر سکے چنانچہ ان کو اس بات کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ فرماتے ہیں "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب **روح حق** آئے گی۔ تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائیگی۔" بہرحال یہ بات تو صاف ہے کہ مسیح مذہب کو نامکمل چھوڑ گئے۔ اور مذہب کی تکمیل کسی آئندہ الہام و نبوت سے وابستہ کر گئے۔ تعصب یا خوش فہمی نے اُس آنے والی روح کا ظہور اُس کلیسیا کے وجود میں دیکھا جسے قدیمی راہبوں نے مسیح کے نام پر قائم کیا تھا۔ وہ کلیسا آج ٹوٹ گیا۔ اس کی تعلیم کا ماخذ انسانی دماغ نکلا۔ خواہ وہ کسی **مقبرا** پرست کا دماغ

ہو یا **فائیلو** کا۔ وہ روح القدس کی باتیں نہ تھیں۔ اور خدا اپنی سنت مستمرہ کے خلاف بھی کیسے کرتا۔ اُس کی (خدا کی) تعلیم ہمیشہ کسی برگزیدہ انسان کی معرفت آئی۔ روح القدس ہمیشہ ایک وقت ایک ہی انسان کی معرفت بولی لیکن مسیحؑ کے بعد ہمیں یہ کہا گیا۔ کہ اب روح القدس ایک جماعت کے ذریعہ سے بولیگی جس کا نام کلیسا ہے۔ بہر حال یہ بھی قدیمی راہبوں کی ایک تجویز تھی جس کے ذریعہ انہوں نے اپنی باتوں کو مقدس اور محترم بنانے کے لئے یہ مسئلہ بنایا کہ کلیسا جو کچھ کہتا ہے وہ روح القدس سے بھرپور ہو کر کہتا ہے +

خدا تعالےٰ نے اپنی سنت قدیمہ کے مطابق عین اُس وقت جب مسیحی تعلیم کو پولوسیوں نے تباہ کر دیا۔ اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے **عرب**[۱] کو نبوت دی۔ وہی نور جو سینا سے نکل کر سعیر سے طلوع ہوا۔ وہی وادئ فاران (مکہ) سے اپنی پوری شعاعوں کے ساتھ ظاہر ہوا[۱]۔ اُس نے مسیحؑ کا جلال ظاہر کیا۔ مسیحؑ کی ذات سے دشمنوں کے الزام دور کئے۔ اس کی صحیح تعلیم کو غلطیوں سے پاک کر کے اس مذہب کے بھی صحیح قوانین و حدود بتا گیا۔ جسے آج مسیحؑ کے نام پر بنانے کی تجویز ہو رہی ہے یعنی **مذہب محبت** جسے یہاں میں رعایت اختصار لکھ دیتا ہوں۔ تفصیل کے لئے تو ایک مستقل کتاب چاہیے +

---

۱ استثنا ۳۳ / ۲-۵ پیدائش ۲۱ / ۱۳ یسعیا ۱ / ۲ یسعیا باب ۲۱

یا

مذہبِ محبّت

اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے مَیں اولاً مذہب اور اُس کے مقصد پر چند الفاظ لکھنا چاہتا ہوں۔ مذہب کی حقیقت و غائت کے نہ سمجھنے نے دنیائے مذہب میں مختلف مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسی سے طرح طرح کے غلط عقائد اور اُن سے غلط اصول تمدّن و تہذیب پیدا ہو گئے۔ قرآن نے جس مذہب کا نام اسلام رکھا ہے۔ وہ ان قوانین الٰہیہ کی اطاعت ہے جن سے انسان کے ودیعت شدہ اور مضمرہ قوےٰ چمک کر بلوغت کو پہنچ جاتے ہیں۔ از رُوئے تعلیم قرآنی محض سجدہ و رکوع کرنا۔ چند فقروں کا زبان پر لانا۔ چند باتوں کو مان لینا مذہب نہیں۔ یہ باتیں اجزائے مذہب تو ہیں مگر عین مذہب نہیں۔ مذہب تو زندگی کا وہ صحیح نظریہ ہے کہ جس کو عمل میں لانے سے انسان وہ چیز بن جاتا ہے جس کے لئے کہ وہ بنایا گیا +

کائنات میں ایک چیز بھی تو ایسی نہیں جس میں گوناگون استعدادیں مخفی نہ ہوں

اُن کے پہنچنے کے لئے خاص خاص لاتبدیل قواعد مقرر ہیں۔ جن سے تمسک کرکے ہر ایک چیز اپنی مخفی استعدادوں کو ظہور میں لے آتی ہے۔ انہی لاتبدیل قوانین الہیہ پر چلنے کا نام **اسلام** ہے۔ کسی درخت کا تخم لے کر دیکھ لو۔ اگر کوزے میں دریا بند ہو سکتا ہے۔ تو پھر وہی تخم ہے۔ ایک رتی بھر چیز۔ اور اس میں ایک بڑا تناور درخت۔ شاخیں پتے پھل۔ پھول۔ رائحہ۔ ذائقہ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ بھرا پڑا ہے۔ قدرت نے اس تخم کو درخت بنانے کے لئے چند قوانین وضع فرمادئے ہیں جس وقت اُن کی اطاعت ہوئی۔ وہ تخم درخت ہو گیا کائنات کی ہر ایک چیز کا یہی حال ہے۔ ان سب کا ایک ہی مذہب ہے۔ یعنی اپنے متعلقہ قوانین پر چل کر اپنے کمال پر پہنچ جانا۔ اسی کا نام لفظاً اور معناً **اسلام** ہے۔ انسان کے اندر لاانتہا استعدادوں کا خزانہ ہے۔ اس کا جسم اُس کے جذبات۔ ادراک تعقل۔ ارادہ۔ تصور وغیرہ۔ پھر ان کے صحیح استعمال سے اُس میں قوت صنعت وایجاد۔ تصنیف وتالیف۔ مختلف علوم وفنون۔ پھر جذبات کا صحیح شکل میں عمدہ اخلاق میں آجانا اخلاق فاضلہ۔ روحانیات وغیرہ۔ غرض یہ سب کچھ انسان کے اندر ہیں۔ کسی سے کسی کا اور کسی میں کسی کا ظہور ہوتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک چیز کے ظہور کا ایک ہی بہترین صحیح ولاتبدیل طریق ہوتا ہے جس پر چلنے کا نام **اسلام** ہے۔ خواہ وہ جسمانیات سے تعلق رکھے یا روحانیات سے ۔

ایک جسم انسانی کی صحیح پرورش کے لئے ہمیں کائنات کی ہر ایک چیز سے تمسک کرنا پڑتا ہے۔ جن کے متعلق پھر الگ الگ قوانین ہیں۔ یہ جو طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ وہ انہی قوانین کی خلاف ورزی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہذا عالم جسمانیات کے قوانین کا دریافت کرنا اور اُن پر چلنے کا نام بھی جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے **اسلام** ہی ہے۔ اس لئے سائنس کی مختلف شاخوں میں جس قدر تحقیق سے نئے علوم پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو وہ سب کے سب **اسلام** ہی کے علوم ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا خود قرآن مجید کہتا ہے۔ **وله اسلم من فی السموات والارض**۔ ہر ایک چیز جو زمین اور آسمان میں ہے۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے آگے سر جھکاتی ہے۔ اس کی بقا اُس کے خواص کا ظہور۔ ان قوانین کی پیروی پر منحصر ہے۔ انہی قوانین کی دریافت کا نام سائنس ہے۔ سائنس کیا ہے؟ دراصل اس ارادہ الہیہ کا علم حاصل کرنا ہے جو کائنات کی کسی چیز کے خلق۔ اُس کے خواص۔ اور اُن خواص کے طریق ظہور کے متعلق ہو۔ اسی وجہ سے مَیں نے اسے بھی علوم اسلام کی ایک شاخ قرار دیا ہے +

ہماری تحقیقات جسمانیات میں بھی جو تجربہ اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے غلطی سے خالی نہیں ہوتی۔ پھر ذہنیات۔ اخلاق اور روحانیات تو کل کی کل نظریات ہیں۔ ان میں تو قدم قدم پر غلطی کا احتمال ہے۔ اس لئے مصلحت ربی نے ان آخر الذکر علوم کو بذریعہ

وحی انسان پر القا کیا۔ لہٰذا ان القا شدہ باتوں کی حقیقت سمجھنا اور اُن پر چلنا مخصوص معنی میں **مذہب اسلام** کہلاتا ہے۔

ان باتوں سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ کہ مقصدِ مذہب از روئے تعلیم قرآن مخفی قوے کا ظہور اور ان کا کمال پر پہنچانا ہے۔ پھر جب ہر ایک چیز اپنے کمال پر پہنچنے کے لئے صدہا قوانین کی پیروی کی محتاج ہے۔ تو انسان جو ایک قسم کا عالم صغیر ہے۔ اور کائنات کی کل قوتیں استعداداً اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ بغیر کسی قانون اور اطاعت قانون کے کس طرح اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے؟ کسی بزرگ کے چند اخلاقی فقرے۔ چند دعائیں۔ اُسکے منہ سے نکلی ہوئی چند لعنتیں یا چند معجزات مذہب حقہ کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح چند امور پر خواہ وہ صداقتیں ہی کیوں نہ ہوں ایمان لانا اور ان پر عمل پیرا نہ ہونا کسی نتیجہ کو پیدا نہیں کر سکتا اگر اس بات پر ایمان لانے سے کہ فلاں خزانہ میں اسقدر زر و مال ہے۔ کوئی شخص دولتمند نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنے قویٰ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرے۔ تو پھر خون مسیحؑ یا کسی ایسی بات پر صرف ایمان رکھ لینے سے فطرت انسانی کے مخفی جوہر نشو ونما نہیں پا سکتے۔ یہ نظریہ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ خود عشاء ربانی کے مسئلہ کو دیکھا جائے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ جس وقت ایک پرستار صدقدل اور صحیح اعتقاد سے شراب کا ایک قطرہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا جسے باپ بیٹے کے نام پر تقدیس دی گئی ہے۔ حلق سے اُتارتا ہے

تو مسیح ہیں اور اُس میں ایک قسم کی وحدت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اس رسم کا نام ہولی کمیونین (مقدس اتحاد بالذات) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس روحانی اتحاد کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی فطرت گناہ مرجاتی اور اُس کو راستباز انسان بنا دیتی ہے۔ بات تو واقعی اعجاز کی ہے۔ اور عیسائی عقیدہ بھی یہی ہے۔ کہ یہ ہولی کمیونین کی رسم جو خون مسیح کی یاد میں ہر اتوار کو گرجوں میں منائی جاتی ہے۔ اعجازاً فطرت میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے لیکن نہایت مایوسی اور افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس اعجاز کا گذشتہ دو ہزار سال میں کوئی عملی ثبوت نہیں ہوا۔ اس قسم کے عقیدوں سے کونسا کفر و الحاد کا مذہب خالی ہے؟ اول تو یہی عشائے ربانی کی رسم مسیح سے ہزاروں برس پہلے من وعن اسی طریق پر۔ اسی شکل میں متھرا کے خون کی یاد میں منائی جاتی تھی۔ جیسا کہ لکھ آیا ہوں۔ پھر ہندوستان میں بُت پرستی کا کونسا مندر ہے جہاں دیوتا کو اشیائے خوردنی سے بھوگ نہیں لگایا جاتا۔ اور پھر بھوگ کی اسی طرح تقدیس و تکریم کی جاتی ہے جیسے عشائے ربانی میں شراب و روٹی کی پھر بھوگ کا لقمہ جس کے حلق سے اُتر جائے۔ اُس میں اور اُس دیوتا میں وحدت ذاتی تسلیم کی جاتی ہے۔

الغرض ان باتوں کی حقیقت ایک داستان سے زیادہ نہیں۔ انسان کا صحیح مذہب وہی ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا ہے جس طرح کسی درخت کے تخم میں ہزارہا ان گنت جوہر مضمر

ہوتے ہیں۔ اسی طرح بے تعداد استعدادیں نطفہ انسانی میں پنہاں ہیں۔ اگر ایک تخم مقررہ قوانین اور راہوں پر چلنے ہی سے ایک باثمر درخت بن جاتا ہے۔ تو انسانی جوہر بھی صحیح قوانین الٰہیہ پر چلنے سے ہی بارور ہوتے ہیں۔ اگر یہ طریق غلط ہے اور صحیح طریق وہی ہے جو مسیحیت تجویز کرتی ہے یعنی یہ کہ صرف ایمان لانے سے ہی انسان نیکوکار ہو جاتا ہے۔ تو جناب مسیح کی تعلیم کو تو مذہب محبت کی تعلیم کہا جاتا ہے۔ پھر میں اس محبت کو عیسوی ممالک کے کس گوشہ میں تلاش کروں؟ جب تک پہلی تین صدیوں میں عیسائی مذہب۔ فقرا۔ غربا۔ خدام اور غلاموں کی جماعت تک محدود رہا۔ عیسائیوں میں ایک حد تک شفقت محبت اور رواداری کے آثار تھے۔ لیکن یہ تو ضرورت وقت یا مرتا کیا نہ کرتا کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے اس حقیقت کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ؎

تواضع ز گردن فرازان نکوست گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

پہلے تین صدیوں کے عیسائی مسلماً گدا اور درویشوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ سوال تو یہ ہے کہ جب شاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر کے آنیوالی مسیحی نسلوں کو **گردن فراز** بنا دیا۔ تو پھر وہ محبت و انکسار و شفقت کہاں گئی؟ میں ان صفحات کو اس قتل و غارت کی داستان سے خون آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ جو عیسائیوں کی عیسائیوں کے ہاتھ سے ہوئی۔ ایک خون کا دریا تھا جو یورپ میں مذہب کے نام پر آج سے ایک صدی پہلے بہتا رہا۔ اور یہ

قاتل ومقتول سب کے سب عیسائی ہی تھے۔ پھر ظلم وسفاکی کے آلات اور مشینیں جو اس مذہب **محبت** کے معلموں کے دماغ نے تجویز کیں۔ اُن کا ذکر تو در کنار اُنکا تصور تک رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو ایک فقرہ میں ادا کر دیتا ہوں۔ کہ عیسائیت کے نام پر جس قدر ظلم۔ خونریزی۔ سفاکی۔ درندگی وغیرہ عیسائیوں نے عیسائیوں کے ساتھ برتی۔ اس کا عشر عشیر بھی مذہب چھوڑ دنیوی معاملات میں کسی قوم نے کسی قوم کے ساتھ مسلسل طور پر نہیں کیا۔ تاتاری سفاکیاں آندھی کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ آج خود عیسائی اُن ایام کا نام **ایام تاریکی** رکھتے ہیں۔ آج بھی مذہب کے نام پر تو نہیں پولٹیکل اور قومی جنگ یورپ میں ہوئے۔ کیا وہ اسی **مذہب محبت** کے مختلف پرستاروں میں نہیں ہوئے۔ **تا بدیگران چہ رسد**

میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں۔ کہ جناب مسیحؑ **مذہب محبت** کو ہی دنیا میں لائے اور میرے نزدیک تو ہر مذہب حقہ کا موضوع یہی ہے لیکن گذشتہ سولہ سو (۱۶۰۰) برس کا تجربہ اور عمل یہ قطعاً ثابت کرتا ہے۔ کہ جناب مسیحؑ کے وعظ وخطبات اپنے مقصد کے پورا کرنے میں یقیناً ناکام رہے۔ اُن کی باتیں تو دل لبھانیوالی ہیں۔ لیکن وہ عمل میں نہیں لائی جا سکتیں کسی معلم کے تعلیم کردہ اصول خواہ کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ معلم خود اُن اصول کو عملاً قائم کرنے کے طریق نہ بتلائے۔ اور آنے والی نسلوں پر ہی ان طریقوں کی دریافت

چھوڑ جائے تو پھر ناکامی ہی ناکامی ہے۔ عیسائیت یا کلیسا مسلماً ناکام ثابت ہوئی۔ اس پر
آج انہوں نے شہادت دی ہے۔ جو مغرب میں آسمان عیسائیت کے روشن ستارے ہیں
اس ساری ناکامی کا باعث اگر ایک سطر میں واضح طور پر بیان ہو سکتا ہے تو میں نے
یہاں بیان کر دیا۔ بالمقابل اسلام اور اس کی اخوت کو دیکھو۔ اس کے عالمگیر ہونے میں کیا
شبہ ہے۔ اَور تو اَور خود یورپ کے ارباب حل وعقد اس سے حیران ہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آتی
کہ اگر فرانسیسی عیسائی ایک جرمن عیسائی کے خون کا آٹھوں پہر پیاسا رہتا ہے۔ تو ایک ہندی
مسلمان کے جذبات محبت پر ہزاروں کوس کا بُعد اور قومی غیرت کیوں اثر انداز نہیں وہ
کیوں ایک دوسرے کے جاندادہ ہیں؟ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے نہ صرف کسی امر
کی ضرورت ہی بیان کر دی یا اُس پر زور ہی دیا۔ بلکہ اس امر کی تحلیل وتفرید کی۔ اُسکے
اصول قائم کئے۔ ان اصول کو وجود میں لانے کے اسباب بتلائے۔ پھر اُن اسباب سے
متمسک ہونے کے طریق تبلائے۔ ان طریقوں پر چلنے کا نام راستبازی اور تقویٰ رکھا۔
پھر اس امر مطلوبہ کے خلاف جن جن باتوں کا امکان تک بھی تھا۔ ان کا سدباب فرمایا
اور ہر ایک بات میں انسانی فطرت کے جذبات۔ اس کے تقاضے۔ اُس کے میلان کو سامنے
رکھا۔ خداداد جذبات کو ہلاک کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ ان جذبات کے لئے ایسے خوبصورت
اور موزون سانچے تجویز فرمائے۔ کہ جن میں جذبات کی رو سے روی تشکل اور ان کا سفلی

سے سفلی جوہر بھی ڈہل کر اخلاق فاضلہ کی شکل اختیار کرلے۔ انسان کے جذبات اپنی ابتدائی اور بہیمی شکل میں مختلف دہاتوں کی اس شکل کی طرح ہوتے ہیں جنہیں ہم فلزات کہتے ہیں۔ یہ سونا۔ چاندی۔ لوہا جو دھاتوں کے بادشاہ ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں کنکر اور پتھر ہی ہوتے ہیں۔ کسی سونے کی کان کو جاکر دیکھ لو۔ سونے کے کنکر بیسیوں مشینوں سے نکل کر طلاء خالص بن جاتے ہیں جس طرح یہ کنکر اور پتھر زمین کی انتڑیوں میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہیمی جذبات کا مولد انسان کا معدہ اور اس کی آنتیں ہیں۔ اب اگر انجیل کی دمی ہوئی مسیحی تعلیم میں جسمانیات کی طرح المرنو ہنیات و اخلاقیات کیلئے ان مشینوں اور آلات کا ذکر موجود ہے۔ تو جناب مسیح **مذہب محبت** کی تکمیل کر گئے۔ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں جیسا کہ خود آج مسیحی فضلائے نے تسلیم کرلیا ہے جس پر اُن کا عمل شاہد ہے۔ کیونکہ وہ اب ان مشینوں کی ساخت کی فکر میں لگے ہیں۔ تو پھر انسان کے بنانے سے تو مذہب نہیں بنتا۔

مذہب محبت کے اصول تو وہی مدون کر سکتا ہے جو فطرت انسانی سے کما حقہٗ واقف ہو علم النفس و القوئے کی باریکیوں سے واقف ہو۔ وہ لوگ اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ جو روح کو اخلاق اور اخلاق کو جذبات بہیمیہ سے اس قدر الگ سمجھتے ہیں کہ گویا ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ پھر جسم کو ادراک سے بالکل جدا گانہ سمجھتے ہیں حتیٰ کہ بعض کے نزدیک **جوہر حیات** بھی جسم سے ایک الگ تھلگ چیز ہے۔ وہ

خیال کرتے ہیں۔کہ یہ جوہر کسی اُور ستارے سے اُتر کر جسم میں آملتا ہے۔ بالمقابل مذہب حقہ یہی ہے کہ جس طرح جوہر اصلی ذرات اثیری سے چل کر مختلف شکلیں اور ہیولے اختیار کرتا ہوا اپنے قوائے مضمرہ کو ظاہر کرتا آتا ہے۔ وہی جوہر اصلی عالم حیوانات میں انسانی جسم اختیار کر کے منزل اول پر بہیمی جذبات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی بہیمی جذبات تعدیل و تادیب میں آ کر اولاً اخلاق عامہ پھر اخلاق فاضلہ اور اس کے بعد روحانیات ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کہ ایک تخم۔ کونپل۔ تنہ۔ شاخیں۔ پتے۔ پھول پھل بن کر سب حالتوں کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اور اس کی ہر منزل کی صورت ایک دوسرے کی ممد و معاون ہوتی ہے۔ اور پھل کی پختگی اور اُس کی خوبی کا حصر ان سب چیزوں کے قیام اور ترو تازگی پر ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کا ایک کامل جوہر اُسی وقت آ کھلتا ہے جب جسم۔ جذبات۔ اخلاق عامہ و فاضلہ سب کے سب قائم رہیں۔ اور سب کی حد و مناسبہ میں آبیاری ہو جس طرح کونپل سے بلکہ پھل تک مختلف شکلیں ایک ہی بیج کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ کل کے کل امور متذکرہ نفس انسانی کی ہی صورتیں ہیں۔ جو دراصل جسم میں سے نکلتا ہے نفس ہی حقیقی اصلاح پا کر مختلف ہیولی بدلتا ہوا روح ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف کی آیت وَالنَّفْسِ وَمَا سَوّٰهَا (نفس جب تعدیل و تہذیب پا جائے) اسی طرف اشارہ کرتی ہے ۔

مجھے یہاں ان دو نظریوں میں سے کسی ایک کی صحت پر بحث منظور نہیں۔ یہ میرے

مضمون سے کسی قدر دُور ہے۔ اگرچہ موجودہ مغربی فضلا کا خیال ان گذشتہ پچاس سالوں میں قرآن کریم کے نظریہ کی طرف آرہا ہے۔ یہ لوگ اب **جوہر حیات**۔ اور راک۔ روح کو کسی اور دنیا سے آیا ہوا نہیں سمجھتے۔ بلکہ جسم کو ہی اُن کی ماں اور مولد قرار دیتے ہیں۔ مجھے یہاں صرف اسی قدر دکھانا ہے۔ کہ ان دو نظریوں کے ماتحت کسی اخلاق کے سدھارنے یا پیدا کرنے کے راستے کس قدر ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف ہو جائینگے۔ جو شخص معانی بالا میں روح اور جسم کو یا جذبات بہیمیہ کو اخلاق فاضلہ سے قطعاً الگ سمجھتا ہے۔ وہ ایک چیز کی پرورش یا حیات دوسرے کی موت و ہلاکت میں دیکھتا ہے۔ وہ راہبانہ نفس کشیاں جو ہندو۔ بدھ اور عیسائی مذہب کی ابتدائی صدیوں میں پائی جاتی تھیں۔ اور ہر طرح بیسود ثابت ہوئیں وہ اسی نظریہ کا نتیجہ تھیں۔ ان کے نزدیک جذبات بہیمیہ یا جسم کو مارنا ہی روح کے لئے ضروری ہے۔ اسلام نے ان سے الگ راہ اختیار کی۔ اسلام کسی جذبہ کی ہلاکت کی سفارش نہیں کرتا۔ اور نہ جسم کو مارتا ہے۔ اسلام کل کے کل جذبات کو مقام اعتدال پر لے آتا ہے۔ جس چیز کا نام محبت خدا اور محبت خلق اللہ ہے۔ جو ہر قسم کی نفسانی ملونیوں سے پاک ہو کر اُس مقام اعلیٰ پر پہنچ جاتی ہے جس کا امتیازی نشان ایثار کا کمال اور بے نفسی کا معراج ہے۔ وہ اپنی ابتدائی شکل میں وہی جذبہ رویہ ہے جس کا نام شہوت حیوانی ہے۔ بالمقابل وہ درندوں کا جذبہ جسے غیظ و غضب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہی حکمت و عقل کی حکومت

کے ماتحت شجاعت۔ سیاست صحیحہ۔ غیرت و غیرہ بنجاتا ہے جس چیز کا نام دیوثی۔ بے عزتی۔ ریا طمع۔ رعایت۔ ناجائز۔ جنبہ داری ہے۔ وہ محبت ہی کی بدنما شکلیں ہیں سے بے رحمی سفاکی غصہ ہی کی قبیح صورت کا نام ہے۔ پھر محبت اور غضب۔ غیر معتدل طریق پر مل کر اگر انسان میں تعصب۔ حسد۔ نکتہ چینی۔ استہزا پیدا کر دیتے ہیں۔ تو یہی غضب و محبت صحیح طریق پر امتزاج پاکر ہم میں استقامت۔ حمایت جائز۔ عدل۔ نصفت شعاری کا موجب ہو جاتے ہیں میں نے تمثیلاً یہ چند باتیں لکھ دی ہیں۔ و الّا انسان کے کل کے کل اخلاق اور اس کی کل کی کل کج خلقیاں انہی دو جذبات محبت و غضب کی دو شاخیں ہیں۔ وہ مذہب حقیقت محبت کیا سمجھ سکتا ہے۔ جو غضب کو ایک مکروہ چیز سمجھ کر اس عطیہ ربی کی فکر ہلاکت میں لگ جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ غصہ اپنے صحیح استعمال میں دراصل درشت شکل میں محبت ہی ہے۔ قوم اور ملک کی محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ہم اُن کی حفاظت کے لئے اُن لوگوں کو سزا دیں۔ جو ملکی قومی حفاظت کے مخل ہوں۔ عدالت کا کمرہ اگر مفاد قومی کی محبت و حفاظت نے بنایا ہے۔ تو اغراض عدالت کا نفاذ غصہ کی اُس شکل میں ہوتا ہے جسے اصطلاحاً جرمانہ۔ تازیانہ جیل۔ پھانسی کہتے ہیں۔ ظالموں کے خلاف جنگ، محبت اور غضب کے صحیح استعمال کا نام ہے ؎

آج سائنس کے انکشافات نے کل پُرانی تھیوریوں کو بدل دیا ہے۔ اور تو اور خود وہ دہریہ سست

بھی جو آسمان سائنس کے روشن ستارے ہیں۔ اپنی تمام سابقہ تھیوریوں کو چھوڑ کر اس بات
کے ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ کل کائنات پر ایک ہی **حکومت** ہے۔ کائنات کا ذرہ
ذرہ ابتدا سے انتہا تک لاتبدیل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ گو ہزاروں ہی قانون
دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن وہ سب کے سب قوانین ایک دوسرے کی معاونت
میں ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود حکیم **ہیکل** نے کائنات کی پہلی سے
پہلی شکل کا نام نہ **مادہ** ۔ نہ **ایٹم** ۔ نہ **عنصر** ۔ نہ **برقی ذرات** ۔ نہ **اثیری**
ریزے لکھا ہے بلکہ یہ سب کے سب جس سے نکلے ہیں اُسنے اس کا نام **لا سبسٹنس** تجویز کیا
ہے۔ یعنی وہ کوئی چیز ہے جو ہمہ **قانون** ہے کاش وہ اس کا نام **لا سپرٹ** (روح
قانون) رکھ دیتا۔ تو ہمارا اور اس کا کوئی جھگڑا نہ رہتا۔ قانون اگر مقنن کو چاہتا ہے۔ تو ہم
ایک اعلیٰ **ہستی** کے قائل ہیں جس سے یہ سب قانون نکلے ہیں۔ وہی اسلامی خدا ہے۔ اب تو
ضدیت کے جھگڑے ہیں۔ ورا معاملہ تو صاف ہے۔ صرف لفظی تنازع باقی رہ گیا ہے۔
چنانچہ جو مذہب ان حکماء دہریت کے نزدیک کائنات پر حکمران ہے۔ اس کا نام وہ
مونازم رکھتے ہیں جس کے لفظی معنی **مذہب توحید** ہے۔ اب یہ اسلام نہیں
تو اور کیا ہے؟ یعنی کائنات کا ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہوئے قوانین پر چل کر اپنے حدِ کمال
پر پہنچنا +

جس بات نے ان حکماء کو **مونازم** (مذہب توحید) کا قائل کرایا ہے۔ وہ یہ بات ہے کہ ایک ہی قسم کے قوانین جسمانیات سے لے کر روحانیات تک کائنات کی ہر منزل ارتقاء پر حاوی ہیں۔ یعنی جسمانی۔ جذباتی۔ ذہنی اخلاقی۔ روحانی قوانین دراصل ایک ہی ہیں۔ چنانچہ مسئلہ زیر بحث میں جذبات بہیمیہ اسی قسم کے قوانین کے ماتحت ارتقائے منازل طے کرتے ہوئے روحانیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس طرح اشیائے خوردنی و نوشیدنی آخر کار خون صالح بن کر روح حیات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جو بشکل نقطہ سیاہ دل میں ہے۔ جسکو زبان عربی میں **حَب** کہتے ہیں۔ بہیمی جذبات کی آخری اعلیٰ و ارفع شکل بھی وہ پاک محبت ہے۔ جو روحانیت کی روح ہے۔ عربی زبان میں لفظ محبت کا مادہ لفظِ **حُب** ہے جس طرح لفظ **خَلق** جس کا جسمانیات سے تعلق ہے۔ ادراکات میں **خُلق** ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حَب بھی حُب ہو جاتا ہے جس طرح معدہ اور آنتیں خون صالح اور حب القلب (سویدائے دل) کی پہلی جائے ولادت ہے۔ اسی طرح مسلم صوفیوں کے نزدیک بہیمی جذبات کا مقام بھی معدہ اور آنتیں ہی ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو آج حکماء مغرب نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جس طرح معدہ کی تیار کردہ چیزیں کیلوس اور کیموس بنکر جگر کی حکومت کے ماتحت تمام نقائص سے پاک ہو کر خون بن جاتی ہیں۔ اُسی طرح قوت غضبی جس کا مقام جگر ہے جذبات بہیمیہ میں سے بہیمیت کو دور کر کے انہیں اخلاق بنا دیتی ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ لفظ **کبد** جس کا اگر

ایک معنی جگر ہے۔ تو دوسرا معنی غصہ وغضب ہے لیکن خون صالح بننے کا سارا نظام اس روح حیات یعنی آکسیجن پر منحصر ہے جو تنفس اور اس کے بعد پھیپھڑوں کے ذریعہ ہر ایک کارکن عضو کو زندگی بخشتی رہتی ہے۔ اس آکسیجن کا نام اسلامی حکماء کی اصطلاح میں روح ہے بالمقابل روح عربی زبان میں الہام کو بھی کہتے ہیں یعنی الہام خداوند۔ جذبات ردیہ کو آخری صورت صالح میں لانے کے لئے وہی فعل کرتا ہے۔ جو آکسیجن در روح ہخون صالح اور پھر اس سے سویدائے قلب بنانے میں کرتی ہے۔ الغرض نظام ایک ہی ہے۔ دل ہی جسماً اور روحاً مرکز روح حیات ہے۔ قربان جاؤں خاتم النبیین علیہ الف الف سلام پر جس نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں کھول دیا۔ حضورؐ فرماتے ہیں "تمہارے پہلو میں گوشت کا ٹکڑا ہے جسکو دل کہتے ہیں جس کے فاسد ہونے سے سب چیزیں فاسد ہو جاتی ہیں"۔

اس مختصر سی بحث سے میری مراد یہ ہے۔ کہ قوت غضبی یا غصہ۔ اصلاح خُلق کے لئے ویسا ہی ضروری ہے۔ جیسے جگر اصلاح خَلق (جسم) کے لئے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ قوت غضبی کی بد استعمالی تمام اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہی حال نظام جسم کا ہے۔ جگر کی خرابی بھی جسم کو بگاڑ دیتی ہے۔ لہذا مذہب محبت کے قوانین صحیح طور پر مرتب نہیں ہو سکتے جب تک جذبہ غضب کی تعدیل و تہذیب کے قوانین مرتب نہ کئے جائیں۔ وہ مذاہب جو اس جذبہ کی بیخکنی کرتے ہیں۔ وہ مذہب محبت کے خادم نہیں ہو سکتے۔ اس معاملہ میں جہانتک

جناب مسیح اور جناب بدھ کی تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ مذہب محبت کی تدوین میں ہمیں پوری مدد نہیں دیتی ہیں۔ وہ تعلیمیں اس ضروری جذبہ کی ہلاکت کے درپے ہیں۔ اگر نظام ملک کے لئے کسی کوتوال یا مجسٹریٹ کی ازحد ضرورت ہے۔ تو نظام اخلاق کے لئے قوت غضبی ہی ضروری چیز ہے۔ ممکن ہے کہ مسیح اور جناب بدھ کی تعلیمات ہم تک اصلی شکل میں نہ پہنچی ہوں یا وہ وقتی ضرورت کا علاج ہوں۔ اگر اُن میں قوت غضبی کو نفرت ہی سے دیکھا گیا ہے۔ اور اس کے عدم استعمال ہی پر زور دیا گیا ہے۔ تو وہ **مذہب محبت** کے قیام کی حارج ہیں ٭

انسان کے طبعی جذبات کی تسکین اُس کو آٹھوں پہر مختلف اشیاء کے حصول میں لگائے رکھتی ہے۔ جن کے حصول سے اس کو راحت اور عدم حصول سے اُس کو رنج ہوتا ہے۔ جن چیزوں سے اس کو راحت ہو وہ اس کی محبوب ہیں۔ اور جو چیزیں اس کے اسباب راحت کی مانع ہوں۔ اُن سے اسکو نفرت ہوتی ہے۔ یعنی اول الذکر اس کے جذبہ محبت اور آخر الذکر اس کے جذبہ غضب کو بھڑکاتی ہے اگر نا جائز اسباب راحت کے حصول کا اسکو کوئی حق حاصل نہیں۔ تو پھر جس طرح اس کی محبت نا جائز ہے۔ اسی طرح اگر جائز اسباب آسائش کے حصول میں موانعات پر اس کو غصہ آجائے۔ تو وہ فعل صحیح ہے۔ الغرض مذہب حقہ کا فرض یہ ہے کہ **محبت** اور **غضب** کے صحیح استعمال بتائے۔ اور انہیں مقام اعتدال پر لے آئے ٭

یہ صفحات اجازت نہیں دیتے۔ کہ میں اس موضوع پر قرآن کریم کی کل ہدایات کو بالتفصیل جمع کر دوں میں قوت غضبی کے متعلق چند موٹے موٹے قوانین لکھ کر ان چند طبعی طریقوں کا ذکر کرونگا جن کے ماتحت **جذبہ شہوت** آخر کار محبت قدسیہ بن جاتا ہے۔

قوت غضبی خلاف طبع یا نقصان وہ امور سے تحریک میں آتی ہے۔ اس جذبہ کے محرک تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ **ایک** وہ جو ہم سے کمزور یا ہمارے ماتحت ہوں۔ **دوسرے** وہ جو ہم پر غالب ہوں۔ **تیسرے** وہ جو ملکی یا قانونی یا کسی اور حقیقت سے ہمارے ہمسر ہوں۔ ان تین گروہوں میں گروہ اول کا مقام بہت نازک ہے۔ کیونکہ اس کی حیثیت ہی ادنےٰ سے ادنےٰ بات پر ہمیں بھڑکا دیتی ہے (بزلہ بر عضو ضعیف می ریزد) اسی مقام پر انسان غصہ میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق ذیل کی ہدایت فرمائی ہے:۔ **"والکاظمین الغیض والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین"**

(مومن) اپنے غضب کو دبانے ہیں (پھر جن لوگوں نے غصہ بھڑکایا تھا ان) لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں (پھر ان سے احسان بھی کرتے ہیں) اللہ تعالےٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ان مقدس ہدایات کی بہترین تشریح جناب امام حسنؓ کے ایک واقعہ سے ہو جاتی ہے۔ آپ کا ایک خادم گرم شوربے کا پیالہ آپؓ کے لئے لایا۔ اتفاقاً اس کے پاؤں نے

لغزش کھائی۔ اور شوربے کا پیالہ گر پڑا جس سے لباس چھوڑ امام معصومؑ کا جسم بھی جلا۔ غصہ کا بھڑکنا طبعی امر تھا۔ لیکن چہرۂ مبارک پر ابھی آثار غضب پیدا ہی ہوئے تھے۔ کہ خادم نے "الکاظمین الغیض" پڑھا۔ امام ہمامؑ نے کامل ضبط سے کام لے کر فرمایا۔ کہ مَیں نے غصہ چھوڑ دیا۔ جس پر خادم نے آیت شریف کا دوسرا ٹکڑا "والعافین عن الناس" پڑھا۔ آپ نے فرمایا۔ مَیں نے معاف کر دیا۔ خادم نے "واللہ یحب المحسنین" کہہ کر آیت شریف کو تمام کر دیا۔ حضرت امام کے اخلاق تو قرآن مجید کے اخلاق تھے۔ آپؑ نے یہ سن کر نہ صرف اپنی خدمت سے ہی اس کو آزاد کر دیا۔ بلکہ زر خطیر دے کر اس کو ہمیشہ کے لئے کسی اَور کی دست نگری سے بھی غنی فرما دیا۔

کہتے ہیں غصہ شیطان ہوتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے۔ کہ شیطان بطور ہمزاد انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے۔ کہ یہ شیطان تعدیل و تادیب سے مسلمان ہو جاتا ہے اب اگر کسی نے غصہ کے وقت اپنے شیطان کو مسلمان بنانا ہو۔ تو اس آیت شریف پر عمل کرے۔ کہاں غیض و غضب اور کہاں اس کے مورد کے ساتھ مروت و احسان۔ احسان محبت کا ایک اعلیٰ مرتبہ ہے جس کے ماتحت ایک شخص غیر حقدار سے مروت کر کے حقیقی محبت کا اعلیٰ ثبوت دیتا ہے۔

تحریک غضب کا دوسرا انتقام کسی ایسے شخص کا مکروہ فعل ہوتا ہے۔ جو ہم سے طاقتور

ہو جس کے مقابل انتقام لینا تو درکنار اظہار غصّہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔ اس کے متعلق جناب مسیحؑ کی تو یہ تعلیم ہے۔ کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیری دہنی گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کُرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے۔ اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا"
(متی کی انجیل باب ۵ آیت ۴۰ تا ۴۲)

جناب مسیحؑ کی یہ تعلیم وقت کے مناسب حال تھی۔ آپ کی قوم محکوم و ذلیل تھی۔ فریق غالب کے مقابل مغلوب کا اظہار غضب کرنا گویا اپنی موت کو آپ بلانا ہے۔ ان حالات میں تو یہ مسیحی وعظ مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے آخر کار ایک دن سچی غیرت اور شجاعت بھی مر جاتی ہے۔ یہ ایک وقتی علاج تو ضرور ہے لیکن اس سے بعض اخلاق فاضلہ کا خون ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان مواعظ کو زندگی کا دستور العمل ہی بنا لیا جائے۔ تو دنیا سے امن اُٹھ جاتا ہے۔ شرارت کی رسی دراز ہو جاتی ہے۔ خود گذشتہ سولہ صدیوں میں عیسائی اس پر عمل نہیں کر سکے۔ لیکن غالب کے فعل ناجائز کے مقابل مغلوب کیا کرے۔ کہ وہ اُس کے شر سے بھی بچ جائے۔ اور اپنے اندر ودیعت شدہ قوائے غیرت و شجاعت کو بھی قائم رکھ سکے؟ ان حالات کے ماتحت بروئے نص قرآنی آنحضرت صلعم نے مسئلہ ہجرت کی تعلیم فرمائی۔ ان مجبوریوں میں انسان کا فرض ہے کہ مقام شرارت کو چھوڑ دے۔ فرعون کے

مقابل جناب موسیٰ کا فعل صحابہؓ کا حبشہ کیطرف چلا جانا۔ پھر خود حضورؐ کی ہجرت اسی قبیل سے ہے؛

تیسرا امر روزانہ زندگی کے متعلق ہے جس میں فعل بد کا ارتکاب کسی ایسے شخص سے ہوتا ہے جسے قانون وغیرہ نے ہمارا ہمسر کر دیا ہے کسی سلطنت کے ماتحت رعایا کا ایک دوسرے کے خلاف بدی کرنا۔ یا ایک قوم کا دوسری قوم کے خلاف کوئی ناجائز فعل کرنا جو موجب جنگ وفساد ہو۔ یہ ایسی باتیں ہیں۔ جن کا علاج مسیحؑ اور بُدھ کی تعلیم تو نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم نے اُس کے لئے یہ ہدایت فرمائی ہے" جزاء سیئة سیئة بمثلها فمن عفی و اصلح فان الله غفور الرحیم"۔ بدی کا بدلہ تو بدی ہے (ہاں) جو معاف کر دے (اور اُس سے) اصلاح ہوتی ہو تو اللہ تعالےٰ غفور الرحیم ہے بمقصد اصلی تو اصلاح ہے۔ اگر شریر کی اصلاح معاف کرنے سے ہو تو معاف کر دیا جائے۔ لیکن اگر معاف کرنے سے شریر شرارت میں بڑھتا ہے۔ یا اس کا فعل دوسروں کو شریر بناتا ہے۔ اور اس سے امن عامہ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ تو پھر بدکار کو سزا دینا ہی لازم ہے۔ جناب موسیٰ نے دانت کے بدلے دانت فرمایا۔ جناب مسیحؑ نے عفو پر زور دیا۔ یہ دونو تعلیمیں اپنے اپنے مقام پر صحیح تھیں۔ لیکن **مہیمن** وحمید کتاب نے اپنے سامنے **اصلاح** کو رکھا جس کے حصول کے لئے اگر ضرورت ہو تو دانت کے بدلے دانت توڑا جائے۔ اور اگر عفو سے نتیجہ مرتب ہوتا ہو تو عفو کیا جائے۔ ان دو حکیمانہ تجاویز کو بیان فرما کر پھر بھی رحم اور معافی کی طرف

انسان کو متوجہ کرنے کے لئے آیت کا خاتمہ ان اللہ غفور الرحیم پر کیا۔ خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ قوت غضبی عطیہ رحمان ہے۔ اگر یہ بُری ہی چیز تھی۔ تو خالق فطرت نے ہمیں کیوں دی۔ ہاں اس کا صحیح استعمال بہت ہی نازک ہے جس کے لئے بہتر سے بہتر ہدایات قرآن مجید نے فرمائیں۔ ساری کتاب ان مندرجہ بالا اصول محکمات کی تشریح میں ہے جن کی تفصیل کی سرورست یہاں گنجائش نہیں۔

غضب کی طرح محبت کی بھی بد استعمالیاں ہیں۔ بے محل پیار غضب سے بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ ایک بچہ کو پیار میں آکر بدعنوانیوں سے نہ روکنا محبت نہیں کہلائی جا سکتی۔ بلکہ اس کی اصلاح کے لئے اُس کے ساتھ نا ملائمت سے پیش آنا ہی اُس سے محبت کرنا ہے۔ گو اُس سے قوت غضبی تحریک میں آجاتی ہے۔ پاک محبت اپنے حقیقی معنوں میں اپنے اظہار کے لئے اُس ایثار و بے نفسی کو چاہتی ہے۔ جو ایک انسان دوسرے کے حقیقی فائدہ کے لئے اپنی مکسوبہ چیزوں یا خداداد طاقتوں کو صرف کرتے ہوئے ظاہر کرے اگر یہ باتیں موجود نہ ہوں۔ تو کسی کا کوئی ایسا فعل جو پیار کے رنگ میں کیا جائے۔ محبت نہ کہلائے گا۔ انسان کی فطرت میں یہ جوہر محبت تو ودیعت شدہ ہے لیکن یہ مذہب حقہ کا کام ہے کہ اس جوہر کو کسی طبعی طریق میں نشوونما دے کر اُسے اُس مقام تک پہنچا دے۔ کہ انسان دوسروں کے مفاد کے لئے جئے۔ اُس کے کل کے کل مکسوبات و مقبوضات اور اس کی تمام

کی تمام خداداد طاقتیں خلق اللہ کے نفع میں لگ جائیں۔ مذہب الہیہ کے سب کے سب اوامر و نواہی کچھ اس قسم کے ہونے چاہئیں۔ کہ جن پر چل کر انسان مخلوق خدا کے لئے شفقت و رحمت ہو جائے۔ اس لئے اسلام کی تعریف آنحضرت صلعم نے تعظیم لامر اللہ و شفقتہ علی خلق اللہ ہی فرمائی ہے۔ اس امر پر میں پہلے بحث کر آیا ہوں۔

اسلام نے اس شجر محبت کا ذخیرہ متاہل زندگی کو قرار دیا ہے۔ جہاں محبت کا پہلا تخم۔ جس کی شکل شہوت حیوانیہ ہے طبعی رنگ میں ایثار کی خو بو لئے ہوئے بے تکلف نشو و نما پانے لگتا ہے۔ زن و مرد در اصل منزل اول میں جذبات حیوانیہ کے ماتحت جمع ہوتے ہیں زوجیت کے پہلے محرک وہ غیر مرئی ننھے ننھے حیوانات ہیں جنہیں طبی اصطلاح میں سپرما اور اووا کہتے ہیں۔ مرد و عورت کی رغبت متقابلہ کے محرک یہی دو قسم کے کیڑے ہوتے ہیں۔ اگر ایک لمبی متاہل زندگی میاں بیوی میں ایسے وقت پاک محبت پیدا کر دیتی ہے جب ایام کہولت انہیں تعلقات زناشوئی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ تو وہ انہی غیر مرئی حیوانات کے کرشموں کا بقیہ ہے۔ اب اگر یہ پاک محبت از قبیل روحانیات ہے۔ تو وہ لوگ غور کریں۔ جو روحانیات کو جسمانیات سے الگ سمجھتے ہیں۔

کتخدائی سے پہلے ایک نوعمر کا نصب العین اس کی اپنی ذات کا مفاد ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی لئے جیتا ہے۔ اپنے ہی واسطے کماتا ہے۔ وہ خود غرضی کا بہت حد تک مجسمہ ہوتا ہے

شادی ہونے پر کچھ تھوڑا ہی عرصہ گذرتا ہے۔ کہ تسکین جذبات شہوانی ہی اُس میں ایثار کا
رنگ پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اب وہ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی کا مالک کسی اوُر
کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب اُس کے بال بچے ہو جاتے ہیں۔ تو اس کی تمام
زندگی اُنہی کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے آپ کو مارتا ہے۔ اور
بطیب خاطر اپنی کمائی سے اپنے لئے فقط روٹی کپڑا نکال کر باقی سب کا سب دوسروں
کا مال سمجھتا ہے۔ اب اگر ایثار کے یہی معنی ہیں۔ کہ انسان کے مکسوبات اور اُس کے قوائے
اپنے سے علاوہ کسی اَوْر کی خدمت میں لگ جائیں۔ اور یہ سب کچھ کسی تکلیف سے نہیں
بلکہ طبعاً و اضطراراً ہو تو یہ رنگ کم و بیش متاہل زندگی ہی میں نظر آتا ہے ؎

محبت کے علاوہ قوت غضبی کے صحیح استعمال کی مشق بھی کنبے میں ہی ہوتی ہے۔ میں
اوپر بیان کر آیا ہوں۔ کہ قوت غضبی اصلاح کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے یعنی جہاں حلیم
طریقے اصلاح نہ کر سکیں۔ وہاں درشت روئی عموماً مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن موقع
اصلاح کے سوا غصہ کا اَوْر مواقع پر رُک جانا ایک نہایت ہی مشکل امر ہے۔ بہر حال یہ
کٹھن سے کٹھن منزل بھی اہل و عیال میں نہایت آسانی سے طے ہو جاتی ہے۔ وہی باتیں
جو کسی اور حالت میں یا اگر کسی اور سے سرزد ہوں۔ تو غصہ و غضب کی محرک ہو جاتی ہیں
وُہی امر جب گھر میں اپنے بچے یا بیوی سے سرزد ہو۔ تو غصہ در کنار لبوں پر ہنسی اور مسکراہٹ

آجاتی ہے۔ بہت سی باتیں اُن کی درگذر کی جاتی ہیں غصہ بھڑکتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ خون پی کر انسان رہ جاتا ہے۔ اور اگر غصہ کا کسی درشت طریق پر اظہار بھی ہونے لگتا ہے۔ تو اُسی وقت جب بچے کی اصلاح اسی ایک طریق پر آ رہتی ہے۔ اور وہاں بھی اگر زدوکوب کی ضرورت پڑے۔ تو انسان کے ہاتھ بے تحاشا نہیں چلتے۔ مارتے وقت بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ بچے کو کہیں صدمہ نہ پہنچے۔ بی بی کے معاملات میں انسان اَور بھی نرم ہو جاتا ہے۔ الغرض غصہ وغضب اگر رحمت بن سکتا ہے۔ تو اس کا آسان محل متاہل زندگی ہے۔ اسی طرح پاک محبت اگر اصلی معنوں میں ہر وقت ظاہر ہوتی ہے۔ تو اس کے محرک بھی بی بی بچے ہی ہوتے ہیں۔ بیشک غور کر کے دیکھ لو۔ طبعاً اور اضطراراً جذبہ شہوت وجذبہ غضب کی حقیقی اصلاح یا تعدیل وتہذیب اگر کہیں ہو سکتی ہے۔ تو عیال داری میں ہی ہوتی ہے۔ یہاں تو وہ ضعیفہ کنواریاں نظر نہیں آتیں۔ جو یورپ میں ہر جگہ پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان حقائق بالا کی تصدیق اگر کسی نے کرنی ہو تو ان کو مغرب میں جا دیکھے۔ بات بات پر بگڑنا۔ چڑچڑاپن۔ زود رنجی اُن کی ایک ادنیٰ شان ہے۔ نہ وہ جوہر محبت اہل وعیال نے اُن کے دل میں چمکایا۔ نہ غصے کی اصلاح کرنے کو اُن کے ہاتھ کوئی بچہ آیا۔ اسی امر کو مدنظر رکھ کر آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ النکاح من سنتی۔ فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ نکاح کرنا میری ایک سنت ہے۔ اور جو اس سے نفرت

کرے۔ وہ مجھ سے نہیں۔ قرآن کریم نے کتخدائی کی علت غائی بھی یہی بتلائی۔ وَمِنْ
اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ
بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط (سورہ روم آیت ۲۱)

یعنی اس آیت میں خدا تعالےٰ فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے جو عورت و مرد کا جوڑا بنایا ہے۔ اس سے کوئی شہوت رانی مراد نہیں۔ زناشوئی کے تعلقات جذبات کو ٹھکانے بٹھا کر مودت اور رحمت کی بیج کو جو فطرت انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ نشوونما کی طرف لے آتے ہیں عور کا مقام ہے کہ قرآن مجید نے کس اعلیٰ حقیقت کو ان مقدس الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ شادی کی غرض کو کس طرح بلند اور ارفع کر دیا ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں۔ کہ وہی قوت غضب اور وہی جذبہ شہوت جس کا نام بہیمیت اور سبعیت ہے اس ایک فعل زوجیت سے رحمت و محبت ہو جاتی ہیں۔ کوئی ہے جو ان باتوں سے انکار کرے۔ وہ مذاہب **مذہب محبّت** کی حقیقت کو کیا سمجھیں جن کے بانیوں نے نہ شادی کی نہ متاہل زندگی کی عزت کی۔ آج فضلائے مسیحیت نے کلیسی مذہب کی تمام تعلیمات کو خیرباد کہہ کر مذہب مسیحیت کا نام مذہب محبت رکھا۔ اور اب وہ اس فکر میں ہیں کہ وہ اس مذہب کے قواعد مرتب کریں۔ وہ بُدھ مذہب کو بھی مذہب محبت ہی سمجھتے ہیں شائد ان کے نزدیک بعض ایسے اخلاقی احکام کا نام محبت ہے۔ جن میں نرم دلی تو کمال درجہ

کی ہو خواہ وہ عملی رنگ اختیار نہ کر سکے۔ ان دونو مذاہب میں زن و مرد کے تعلقات
کے متعلق کم و بیش تعلیمات تو ہیں۔ لیکن اُن کے بانیوں کی عملی زندگی ہمارے لئے راہِ ہدایت
نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف اسلام نے متاہل زندگی کو ایک لطیف اور پاراحت زندگی
بنانے کے لئے اس قدر قوانین دئے ہیں۔ کہ ان کی نظیر کہیں نظر نہیں آتی۔ قوت غضبی کے
متعلق میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ کہ اُس کے اظہار کا آسان موقع وہ ہوتا ہے۔ کہ جہاں موردِ غضب
اپنے سے کمزور یا اپنے قبضے میں ہو۔ بیوی بچوں سے بڑھ کر اور کون نہایت آسانی کے ساتھ
موردِ غضب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ اس کثرت
کی روک تھام کے لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ۔ یعنی تم میں سے
بہترین انسان وہی ہے۔ جو اپنے بال بچوں کے ساتھ نیکی کا سلوک کرے۔ گھر کے باہر تو
ہماری وضعداری یا دوسروں کا خوف یا سوسائٹی کا پاس ہم سے اضطراراً اور مجبوراً اچھے
اخلاق ظاہر کرا دیتا ہے۔ لیکن گھر کا میدان تو ایک وسیع اور کھلا میدان ہے۔ وہاں تو
ہم جو چاہیں کر گذریں۔ لیکن جب اس میدان میں ہی اضطراراً مذکورہ بالا حکم نبیؐ کے ماتحت
ہم مروت اور رحمت کا ہی اظہار کرتے ہیں۔ تو لازماً بیرونی دنیا میں بھی ہمارے اخلاق سلجھ
جاتے ہیں۔

کتخدائی کے تعلقات کا دائرہ اہل و عیال کے بعد اپنے احاطے میں اور رشتہ داروں

کو بھی لے آتے ہیں۔ کچھ بی بی کے رشتے وار کچھ اپنے رشتہ دار اُس رحمت و مودت کے بھی
مستحق ہو جاتے ہیں۔ جو ہم بچوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ایثار جو ہم اپنے گھر میں برتتے ہیں
وہی دوسرے رشتے داروں کے حق میں بھی ایک حد تک ظاہر ہوتا ہے۔ رشتے داروں
کی ذیل میں ہی وہ افراد بھی آجاتے ہیں۔ جن سے رشتہ اتحاد و دوستی قائم ہوتا ہے۔ یہ دائرہ
محبت یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ وسعت پاکر دوستوں کے بعد ہم قوم و ہم مذہب اور پھر اُن کے بعد
ہم ملک کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے۔ انسانی ہمدردی اس دائرے کو اور بھی وسیع کرکے انسانی
محبت و رحمت کا مورد کل بنی نوع کو بنا لیتی ہے۔ اس کے بعد ایک ہی منزل باقی رہ جاتی ہے
کہ جب انسان ربانی اخلاق سے متصف ہو جاتا ہے۔ تو اس کی محبت و رحمت مخلوق الٰہیہ کے
ہر نوع و صنف تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ارفع ہے کہ جہاں انسان رب العالمین کا
مظہر اتم ہوتا ہے لیکن شرط یہ ہو کہ جو محبت۔ رحمت۔ ہمدردی یا ایک لفظ میں شفقت وہ اپنے دائرہ
اعیال میں ظاہر کرتا ہے۔ وہی شفقت وہ مخلوق الٰہیہ کی ہر نوع سے علیٰ قدر مراتب ظاہر کرے
جس طرح ہر عالم میں ارتقا کی سات ہی منزلیں ہیں۔ وہی سات منازل یہاں بھی موجود ہیں
جن میں سے گذر کر بہیمیت و سبعیت یعنی شہوت و غضب وہ روحانیات بن جاتی ہیں۔
جن کی ہمسائگی میں الوہیت کھڑی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے قاب قوسین کہتے ہیں جہاں
انسانی قوس کا وتر الٰہی قوس کے وتر سے جا ملتا ہے۔ ان سات منازل کو میں پھر گن جاتا ہوں

حکیمانہ اصطلاح میں طبعی جذبات کا احساس اور اُن کے تقاضوں کے تتبیہ کے فکر کا من
کل الوجوہ مفہوم ایک لفظ **ادراک** سے ادا ہوتا ہے۔ یعنی ہمارا اپنی راحت و تکلیف کو
محسوس کرنا پھر جلب منفعت اور دفع مضرت کا علاج سوچنا سب لفظ ادراک میں آجاتا ہے
اس ادراک کی پہلی شکل وہی بہیمیت و سبعیت اور اس کے تقاضے ہیں۔ جسے فلسفی اصطلاح
میں ادراک حیوانی کہا گیا ہے۔ یہ ادراک بطور مواد کے ہے۔ جسے عربی زبان میں **بلغہ**
کہتے ہیں۔ اسی میں سب استعدادیں اعلےٰ سے اعلےٰ اور ادنےٰ سے ادنےٰ موجود
ہیں۔ اسی نے ترقی کر کے اخلاق فاضلہ اور روحانیت بننا ہے۔ لیکن اس نے
بلوغت یعنی ارتقاء کی سات منزلیں طے کر کے اس کمال حقیقی کو پہنچنا ہے جسے
قرآن **صبغۃ اللہ** کہتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان خدا تعالےٰ کا مظہر اتم
ہو جاتا ہے۔ اور خدا اُس کے ہاتھ پاؤں اور روح ہو جاتا ہے جیسے حدیث شریف
میں آیا ہے۔ اور اس کی ارتقائی سات منزلیں یہ ہیں:-

اوّل۔ ادراک ذاتی۔

دوم۔ ادراک منزلی یا اہلی۔

سوم۔ ادراک اصدقائی

چہارم ادراک قومی و ملی

پنجم ۔ ادراک ملکی

ششم ۔ ادراک نوعی

ہفتم ۔ ادراک کونی +

یہاں ان ادراکات مختلفہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان اپنی ضرورت کو محسوس کرتا ہے ۔ اور اُس کے دفعیہ کی فکر میں ہوتا ہے ۔ اسی طرح وہ اہل و عیال رشتہ داروں ۔ دوستوں ۔ ہم قوموں ۔ ہم ملکوں ۔ ہر نوع انسان وغیرہ کی ضروریات کو اپنی ضرورت کی طرح محسوس کرے +

انسان دنیا میں ادراک حیوانی لے کر آتا ہے ۔ لیکن جب اس ادراک سے آگے چلتا ہے ۔ تو اس کے مدارج رفعت بھی اس کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں ۔ وہ جس درجے کے ادراک کو لے کر اس جہان سے رخصت ہوتا ہے ۔ وہی درجہ رفعت اُسے اگلے جہان میں ملتا ہے ۔ معراج والی حدیث میں ہمارے نبی کریمؐ نے جناب آدمؑ کو تو پہلے آسمان پر دیکھا ۔ اور باقی نبیوں کو باقی کے آسمانوں پر ۔ ان میں سے جناب مسیحؑ تو چوتھے آسمان پر تھے ۔ اور ابو الانبیاءؑ جناب ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر ۔ مذکورہ بالا نظریہ کی روشنی میں یہ عرفانی حقیقت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے ۔ جناب آدمؑ کے ارد گرد اُن کا اپنا ہی اہل و عیال تھا ۔ اُن کا ادراک پہلی منزل پر تھا ۔ انجیل میں جو جناب مسیحؑ کا

نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہاں اُن کا ادراک قومی ادراک سے آگے نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ہمدردی اور ہدایت کو اسرائیلی قوم تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ اپنا مشن اسرائیلی بھیڑوں تک محدود کرتے ہیں۔ وہ سوروں کے آگے موتی پھینکنا اور کتوں کے آگے بچوں کی روٹی ڈالنا نہیں چاہتے۔ کتوں اور سوروں سے اُن کی مراد غیر مختون قومیں ہیں۔ نہ معلوم یہ غیر مختون قومیں کیوں خوشی سے عیسویت کے جوئے تلے آگئی ہیں۔ وہ اگر آہ و واویلا کرتے ہیں تو بنی اسرائیل کے لئے۔ نہ کسی اور قوم یا نسل انسانی کے لئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اُن کا ادراک چوتھے درجے پر تھا۔ جناب موسٰے اگر ان سے اگلے آسمان پر نظر آتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ اسرائیلیوں کے علاوہ قبیلوں کو بھی اپنے دائرہ ہدایت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ کا نقشہ جو قرآن شریف اور بائیبل ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ وہاں اُن کے اخلاق۔ اُن کی ہمدردی۔ اُن کا احساس انسانیت اپنی قوم سے آگے چل کر ہر بنی نوع کے لئے یکساں نظر آتا ہے۔ قوم لوط کو عذاب سے بچانے کے لئے وہ خدا سے ملتجی ہیں۔ گو وہ قوم اُن سے تعلق نہیں رکھتی۔ اُن کا دسترخوان ہر قوم و ملت کے انسانوں کے لئے کھلا ہے جس میں وہ کوئی قومی و ملی و لسانی و لونی تمیز نہیں کرتے لہذا یہ امر ضروری تھا کہ ان وسیع اخلاق کا انسان عالم بالا میں ساتویں آسمان پر ہی نظر آئے۔ لیکن خاتم النبیین کے ادراک کا نقشہ قرآن کریم نے جن الفاظ میں کھینچا ہے

وہ اس سے بھی ارفع ہے۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین یعنی اُن کا مرنا جینا اُن کی زندگی کے سب کام اُس ہستی کی خدمت اور اُسکی منشاء کو پُورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو تمام مخلوق کا رب ہے۔ اس مقام عظمٰی کے اوراک والا اپنے معراج میں اگر ساتوں آسمانوں سے گذر کر عرش عظیم تک نہ پہنچے۔ تو پھر اور کون پہنچے +

قرآن کریم نے ایک ایک طبقہ مخلوق الٰہیہ کو لے کر اُسے انسان کی محبت اور شفقت کا مورد بنایا ہے۔ پھر مختلف راہیں اور طریق بتلائے جن سے رحمت اور محبت کا بیج فطرت انسانی میں سے نکل کر ایک ایسا باثمر درخت بن جائے۔ کہ جس کے سایہ تلے مخلوق الٰہی آجائے۔ پھر ان تمام وجوہ کو جو اس رحمت و محبت عامہ کی راہ میں روک ہو جائیں۔ سامنے رکھ کر مختلف تعلیمات سے اُن سب کا قلع قمع کیا۔ وہ باتیں جن سے غیریت و اجنبیت لاپروائی کینہ عداوت پیدا ہوں۔ انہیں گناہ اور بدی قرار دیا۔ الغرض کتاب حمید نے ایک ایسا نظام ابلغ تجویز کیا۔ کہ جس سے بہتر مذہب محبت کی تدوین کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میں ان صفحات میں ان تمام باتوں کی تفصیل کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ میں اس کتاب کے خاتمہ پر قرآن کریم سے چند آیات کو نقل کر دیتا ہوں۔ جن میں ایک مسلم مخلوق الٰہیہ کے مختلف طبقات سے محبت و شفقت کرنے کے لئے

مامور کیا گیا ہے۔ خدا تعالٰے نے توفیق دی۔ تو پھر اس مضمون پر بالاستیعاب لکھوں گا +

آنحضرت صلعم کے وقت سے لیکر آج تک ہر نماز جمعہ کے خطبہ میں منبر سے ایک آیت سُنائی جاتی ہے جس میں ایک مسلم کو انہی اوراکات مذکورہ بالا کے نشو ونما میں لانے کی تحریک کی جاتی ہے۔ ان اللہ یامر کم بالعدل والاحسان وایتاء ذوالقربیٰ وینہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون

اس آیت کے دو ٹکڑے ہیں پہلے حصے میں چند محاسن کا ذکر ہے جن کی طرف ترغیب دلائی جاتی ہے۔ اور دوسرے میں چند بدیوں کا ذکر ہے جس سے انسان کو روکا گیا ہے۔ اور آخیر میں کہا گیا ہے کہ مسلمانو ان باتوں کو نہ بھولنا۔ بلکہ آٹھوں پہر یاد رکھنا۔ میں پہلے حصے کو لیتا ہوں۔ اس میں تین باتوں کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا ہے عدل۔ احسان اور وہ شفقت جو ایک شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ کرتا ہے۔ عدل سے مراد اپنے حقوق لے لینا۔ اور دوسروں کے حقوق کی عزت کرنا۔ اس کے بعد پھر حسنات کا باب شروع ہوتا ہے۔ احسان عموماً ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جن کا کوئی حق ہم پر نہ ہو۔ بلکہ کسی تعلق کے بغیر ہم دوسروں سے نیکی کریں۔ احسان کنندہ علی العموم احسان یافتہ سے کسی نہ کسی امر کی توقع رکھتا ہے۔ خواہ وہ از قسم تشکر و امتنان کے رنگ میں کیوں نہ ہو۔ لیکن انسان کی فطرت میں اس قسم کی نیکی کرنے کے بھی جوہر

ہیں۔کہ وہ بلا کسی عوضہ یا شکریا استحسان کی امید کے دوسروں سے نیکی کرتا ہے۔ بلکہ اس کا احسان یافتہ اگر اُس کے خلاف مرضی بھی کوئی کام کرے۔یا اُسے تکلیف بھی دے۔لیکن اُس کی طرف اس کی نیکی دریا کے پانی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ یہ بہت ہی بلند اور مشکل مقام ہے لیکن اس مقام پر پہنچے ہوئے قریباً کل کے کل انسان اپنے گھروں میں نظر آتے ہیں۔ اپنے بچوں سے جو ہم حُسن سلوک کرتے ہیں۔ وہ کسی اجر یا شکر کو نہیں چاہتا۔ ان کی بدعنوانیاں بھی ہمیں نیکی کرنے سے باز نہیں رکھتیں قرآن کریم نے اس آیت میں ایتاء ذی القربیٰ فرماکر اشارہ کیا۔کہ تم میں جو محبت اور شفقت کا رنگ اقارب کے معاملے میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ امر تم کو ہر ایک مخلوق الٰہیہ کے معاملہ میں ظاہر کرنا ہے +

اور اک حیوانی اور ادراک انسانی میں جو امر بطور مابہ الامتیاز ہے۔ وہ ادراک ذاتی ہے۔حیوان ہر ایک چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔جس وقت اس کے قوائے شہوانی محرک ہوتے ہیں۔اُس وقت جو چیز بھی اس کے سامنے آجائے۔اس پر منہ مارنے سے وہ نہیں ٹلتا۔ایک گائے بھوک کے وقت کسی غیر کی کھیتی میں منہ ڈال دیتی ہے۔اُسے نہ یہ سمجھ ہے اور نہ پروا۔کہ اس کھیت کا مالک اس کا مالک نہیں۔ ہزاروں انسان ہر جگہ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔جن میں یہ حیوانی خاصہ ہوتا ہے۔ہاں انسان میں یہ استعداد

ہے کہ وہ اپنی اور غیر کی چیزیں میں تمیز کر سکے۔ یہی تمیز جب صحیح طور پر کام کرنے لگتی ہے۔ تو دنیا میں امن اور نصفت شعاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تمیز صحیحہ کا نام **ادراک ذاتی** ہے +

ادراک حیوانی کو ادراک ذاتی میں متشکل کرنے کے لئے قرآن کریم نے آیت زیر بحث میں سب سے اول عدل کا حکم دیا جس سے مراد یہ ہے۔ کہ جو تمہاری چیز ہے تم لے لو اور جو دوسروں کی چیز ہے وہ دوسروں کو دے دو۔ اس عدل کی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے مختلف مقامات میں امانت پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا۔ ان اللہ یامرکم ان تعدو الامانات الیٰ اھلھا۔ جو چیز بطور امانت تمہارے پاس ہے۔ وہ اُن کے مالکوں کو دے دو۔ جس وقت انسان قوت عدل اور اُس کے استعمال میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کسی ایسی چیز پر نگاہ تک نہیں ڈالتا جو اُس کی نہ ہو تو پھر قرآن کریم اُسے احسان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یعنی جو چیزیں اُس کی اپنی ہیں۔ وہ دوسروں کو دے۔ احسان کے پہلے عدل کا ذکر کرکے اس قسم کے احسانوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔ جو چوروں خائنوں دوسروں کا مال مارنے والوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔ دنیا میں لکھوکھا انسان اپنی فیاضی میں تو حاتم ثانی ہوتے ہیں لیکن اُن کی سخاوت جس مال سے ہوتی ہے۔ وہ صدہا غیروں کی حق تلفیوں کا نتیجہ ہوتا

ہے۔ صحیح احسان کا ظہور اپنی ہی مکسوبات سے ہوتا ہے۔ پھر اس احسان میں جو عنصر ضروری ہے جس سے انسان اخلاق الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان غیروں کے ساتھ اُسی رنگ میں احسان کرے جیسے اپنے بال بچوں عیال واقارب سے کرتا ہے۔ انسان میں یہ قوت تو ہے۔ جیسے میں نے پہلے بیان کیا لیکن اس قوت کو بارور کرنے کے لئے ایک اور موقعہ پر فرما دیا۔ کہ انسانوں کو جو کچھ ہم نے عطا کیا۔ اُس کے اعضاء جوارح اس کی قوتیں اس کی استعدادیں یہ سب کے سب ہماری طرف سے اُس کے پاس بطور امانت ہے۔ اور انسان اس عطیہ کو بطور امانت سمجھنے کا اہل بھی ہے۔ جیسے کہ فرمایا۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

ترجمہ یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ تو اُنہوں نے انکار کیا۔ کہ اس کا بوجھ اُٹھائیں۔ اور اس سے ڈرے۔ اور انسان نے اس کا بوجھ اُٹھا لیا۔ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا اور نہ جاننے والا ہے (الاحزاب ۷۲)

یہ صداقت حقہ ہے۔ انسان کے سوا کل مخلوقات کو دیکھ لو۔ ان میں ضرورت

وقتی کے دفعیہ سے زیادہ اسباب دفعیہ ضرورت سے تمسک کی استعداد نہیں ہوتی۔ جانوروں
میں ہی دیکھ لو۔ ہر ایک وقتی ضرورت کا ہی علاج کرتا ہے۔ آئندہ کے لئے کسی چیز
کو پس انداز کرنے کی اُن میں استعداد ہی نہیں ہوتی۔ اس قاعدۂ عامہ میں اگر استثنا
ہے۔ تو صرف چند جانوروں میں۔ جو سال کے کسی حصہ میں اپنے مامن یا جگہ سے
نہیں نکل سکتے۔ مثلاً چیونٹی یا زنبچہ یا چند ایک اور جانور۔ سردیوں میں یہ اپنی جگہ
سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اس لئے سرما کی خوراک کے لئے وہ کچھ نہ کچھ پس انداز
کر لیتے ہیں لیکن اُنہیں یہ ادراک پس اندوختگی بھی محدود ہی ہوتا ہے۔ ان کا ادراک
آئندہ موسم سے آگے تک نہیں جاتا۔ بالمقابل انسان کو دیکھ لو اسے اگر مساعد حالات
میسر آجائیں۔ تو وہ ساری عمر کے واسطے نہ صرف اپنے ہی لئے بلکہ اوروں کے لئے
بھی مایحتاج آسانی سے جمع کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے انتھک قوائے اپنی
ذاتی ضرورت سے زیادہ چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔ آخر ش اس ربانی اقتصاد کا مطلب
سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ یہ سب قوٰے اور استعدادیں اُسکی اپنی ذات
کیلئے نہیں ہیں۔ بلکہ اوروں کے لئے دی گئی ہیں۔ یہ بطور امانت ہیں۔ اور ان امانات
کی اہل خدا کی کل مخلوق ہے +

الغرض ایک طرف تو انسان میں ادراک ذاتی پیدا کر کے اُسے عدل کی طرف

متوجہ کیا۔ دوسری طرف اس میں احسان اور ایتاء ذی القربےٰ والی نیکی کرنے کے جوہر رکھ کر اُسے اطلاع دی۔ کہ تجھے جو کچھ دیا گیا ہے۔ وہ بطور امانت دیا گیا ہے۔ پھر انسان میں فطرتاً رضامندی خداوند کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھے۔ اسلئے خوشنودی خداوندی اسکا نصب العین ہوتا ہے۔ قرآن نے خوشنودی خداوندی کے حصول کا ذریعہ بھی حسنات خیرات اور احسان ہی بتلایا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا کا غصہ حسنات وخیرات سے دور ہو جاتا ہے۔ الصدقت تطفیٔ غضب ربی +

انسان میں ایک اور بھی تڑپ ہے وہ چاہتا ہے کہ اُسمیں خدائی رنگ پیدا ہو جائے۔ اسی خواہش نے بعض ربانی رنگ میں رنگین انسانوں کو عام نگاہ میں خدا کر دکھایا عیسیٰ۔ عذرا۔ کرشن۔ رامچندر۔ زرتشت اسی لئے اللہ اور ابن اللہ کہلائے۔ اسلام کی روسے بھی نفس ناطقہ کی تکمیل کا مقام یہی ہے۔ یعنی جب انسان سے اخلاق خداوندی سرزد ہوں۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ تخلقوا باخلاق اللہ بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اب جس خدا کا نقشہ قرآن مجید نے کھینچا ہے۔ اس کی یوں تو ننانوے صفات ہیں۔ لیکن ان سب صفات کی اُم چار صفات ہیں۔ رب۔ رحمٰن رحیم۔ مالک یوم الدین۔ اب جو خدائی رنگ اپنے میں پیدا کرنا چاہے۔ وہ انسانی احاطہ میں ان صفات کا متصف اپنے آپ کو بنائے۔ مالک یوم الدین۔ وہ خدا ہے

جوکسی کا حق نہیں رکھتا۔ جو جس کا مستحق ہو وہ اُس کو دے دیتا ہے۔ اس صفت کے ماتحت انسان میں لازماً صفت عدل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے چل کر رحیمیت کی شان مخلوق کو ایک کے عوض میں دس سو یا اس سے بھی زیادہ بخشتی ہے۔ یہ رنگ احسان کا ہے۔ اس سے آگے چل کر صفت رحمانیت بلا عوضہ بلا تمیز قوم و ملت ہر ایک کے لئے در فیض کھول دیتی ہے۔ انسانی دائرہ میں یہ رنگ ایتاء ذی القربےٰ سے شروع ہوتا ہے لیکن چونکہ خدا کے حقیقی پرستار خدا کی راہوں پر چلتے ہیں۔ اس لئے حقیقی رحمٰن کا بندہ وہی ہوتا ہے جس کی ایتاء ذی القربےٰ والی نیکی دائرہ اہل و عیال سے نکل کر ہر مخلوق الٰہی تک پہنچے۔ شان ربوبیت کے تو کیا کہنے۔ وہ سب کا پالنہار۔ سب کا رزاق۔ سب کا قیوم۔ اور سب کی استعدادوں کو حد بلوغت تک پہنچانیوالا ہے۔ اب جس کا جی چاہے۔ خدائی رنگ میں رنگین ہو جائے۔ لیکن اگر قرآنی خدا کے صفات سے متصف ہونا چاہے۔ تو پھر اُس سے بڑھ کر **مذہب محبّت** کا کامل عامل اور کون ہو سکتا ہے؟

جس بات نے مجھے حیران کر رکھا ہے۔ وہ قرآن کا وہ نظام ابلغ ہے۔ کہ جس کے ماتحت کل کا کل قرآن انہی مختلف آیات سے اس طرح مربوط ہے۔ کہ اس کی ایک آیت بھی دوسرے کے نقیض نہیں پڑتی۔ اگر ایک جگہ اصول محکمات دئے ہیں۔

تو دوسری جگہ ان کی تشریح کر کے وہ ہدایات فرمادی ہیں۔ کہ جن پر چل کر وہ اصول صداقت
مثبتہ ہوجائیں۔ اس معاملہ میں اس امر زیر بحث کو دیکھ لو۔ اگر مذہب محبت کو دُنیا
میں قائم کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ کہ تم خدا کے صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ تو پھر ایک
طرف خدا کے صفات وہ دئے۔ جو مذہب محبت کی جان ہیں۔ اور جن کے رنگ میں
رنگین ہو کر اوراک حیوانی اوراک ذاتی بن کر مختلف منازل طے کرتا ہوا اوراک
کونی ہوجاتا ہے۔ اگر مالک یوم الدین کا مظہر وہی شخص ہوسکتا ہے جس میں
اوراک ذاتی صحیح شکل میں پیدا ہوجائے۔ تو رحیم اور رب العلمین کا مظہر بھی وہی انسان
ہوسکتا ہے جس میں یکے بعد دیگرے کل اوراک پیدا ہو کر آخر کار اوراک کونی بصورت
اتم پیدا ہوجائے۔ یہ باتیں کس طرح حاصل ہوں۔ اس کے لئے ہر جمعہ کی نماز میں جیسا
کہ مَیں نے پہلے ذکر کیا۔ آیت ان اللہ یامر کم بالعدل والاحسان وایتاء
ذی القربیٰ پڑھوائی۔ جس کا دوسرا ٹکڑا ان بدیوں کو روکتا ہے۔ جو اُن اوراکات
کے پیدا ہونے میں مانع ہے۔ آنحضرت صلعم نے اگر بچوں کے نام رکھنے کے متعلق یہ
فرمایا۔ کہ خدا کے نام پر نام رکھو۔ مثلاً عبد الرب۔ عبد الرحمان۔ عبد الرحیم۔ عبد المالک
تو اس کی بھی یہی حقیقت تھی۔ عبد المالک وہی ہے جس میں اوراک ذاتی کامل طور پر
نشوونما پاگیا ہو۔ عبد الرحیم۔ عبد الرحمٰن اور عبد الرب وہی کہلا سکتا ہے جس میں اوراک

ذاتی کے بعد ادراک منزلی - ادراک اصدقائی - ادراک قومی - ادراک ملکی - ادراک نوعی اور ادراک کونی پیدا ہو جائیں +

اب مَیں ذیل میں قرآن مجید کی چند آیات لکھ دیتا ہوں جن میں ان ادراکات کے پیدا کرنے کی ہدایات فرمائی گئیں - مَیں ان میں اس ترتیب کا عدم فرصت کے باعث لحاظ نہیں رکھتا جس سے ان ادراکات مختلفہ کا الگ الگ تعلق ہے +

شروع میں مَیں چند آیتیں ایسی بھی دے دیتا ہوں - جو انسان کو عفو کی طرف مائل کرتی ہیں - کیونکہ دوسروں کی خطائیں بعض وقت مانع محبت ہو جاتی ہیں بعض وقت انسان کی متکبرانہ طبیعت اُسے اُن لوگوں کی طرف مائل ہونے نہیں دیتی - جن کی طرف توجہ کرنا ہی اُس کے اخلاق کی تہذیب کا موجب ہو جاتا ہے +

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (لقمان ۱۸-۱۹)

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران ۱۳۴)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (حم - ۳۴)

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (الاعراف ۱۹۹ - ۲۰۰)

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ○ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ○ إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (المعارج ۱۹ تا ۲۵) فَكُّ رَقَبَةٍ ○ أَوْ إِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ○ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ○ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ○ (البلد ۱۳ تا ۱۸)

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (النساء ۳۶)

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ؕ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○ إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ

الشَّیٰطِیۡنِ ؕ وَلَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا کُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ۝ اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ (بنی اسرائیل ۲۳-۲۴-۲۶-۲۹-۳۰)

وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡهِ ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰی وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیۡکَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ۝ (لقمان ۱۴)

قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ (البقرہ - ۲۱۵)

وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیۡهِ رِزۡقَهٗ ۬ۙ فَیَقُوۡلُ رَبِّیۡۤ اَهَانَنِ ۝ کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۝ (الفجر ۱۶-۱۷-۱۸)

عَنِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ مَا سَلَکَکُمۡ فِیۡ سَقَرَ ۝ قَالُوۡا لَمۡ نَکُ مِنَ الۡمُصَلِّیۡنَ ۝ وَلَمۡ نَکُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡکِیۡنَ ۝ (المدثر - ۴۱ تا ۴۴)

وَیُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسۡکِیۡنًا وَّیَتِیۡمًا وَّاَسِیۡرًا ۝ اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡهِ اللّٰهِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا ۝ (الدہر ۸-۹)

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَیُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝ (البقرہ - ۲۷۱)

لَا یَنۡهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ

دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الممتحنہ ۸)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرہ ۱۷۷)

ان آیات کا کھلا کھلا ترجمہ میں یہاں دیدیتا ہوں :-

حقارت یا نفرت سے دوسروں سے منہ نہ پھیرا کرو۔ نہ متکبرانہ طریق پر سر اٹھائے زمین پر چلا کرو۔ اللہ تعالےٰ فخر کرنے والوں اور خود پسندوں سے محبت نہیں کرتا۔ چلنے میں صحیح راستہ پر قدم رکھو۔ آہستہ بولا کرو۔ اور آواز اونچی نہ کرو (یہ بھی ایک تکبر و نخوت کی ایک نشانی ہے) متقی لوگ وہی ہیں۔ جو تکلیف و راحت میں خیرات کیا کرتے ہیں۔ غصہ کو دبا لیتے ہیں۔ اور لوگوں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ محسنین کو ہی پسند کرتا ہے۔ نیکی تو بدی کے برابر نہیں ہوتی (اگر کوئی تم سے بدی کرے یا تکلیف دے) تو بدی کا عوضہ کسی بہتر طریق پر کیا کرو۔ بدی کے عوض نیکی کر چھوڑا کرو

دیکھ لینا۔ اس طریق سے وہ بھی جو تمہارا دشمن ہو گہرا دوست بن جائے گا۔ عفو سے کام لیا کرو۔ اور نیکی کی طرف لوگوں کو متوجہ کرو۔ اگر کسی جاہل سے معاملہ پڑے۔ تو اُن سے اعراض ہی کر لیا کرو۔ اگر کوئی شیطان نش، کوئی الزام بھی لگائے۔ اور اُس سے تمہیں تکلیف ہو (تو بہتر یہی ہے)، کہ خدا کی طرف ہی رجوع کیا کرو۔ وہ سب کچھ جانتا۔ اور سب کچھ سنتا ہے۔ انسان کی طبیعت میں شتاب کاری ہے مصیبت آئے تو گھبرا جاتا ہے۔ بالمقابل جب اس کے حالات اچھے ہو جائیں۔ تو پھر ممسک ہو جاتا ہے۔ (اس کا علاج یہی ہے)کہ نماز پڑھو۔ اور آٹھ پہر خدا کی یاد میں لگے رہو۔ اور اپنے مال و دولت میں سے ایک حصہ الگ کر دو۔ جو فقراء کے کام آوے۔ اور ایسی مخلوق کے جو (ذرائع روزی سے) محروم ہو (محروم کی مد میں کُتا۔ بلی وغیرہ سب جانور بھی آجاتے ہیں) (تمہارے سامنے بڑے بڑے مشکل کام ہیں، لیکن سب سے بڑی مہم کا حل کرنا اسی میں ہے کہ غلاموں کو آزاد کیا جاوے۔ قیدیوں کو قرضداروں کو نجات دلائی جاوے۔ (یہ لوگ بھی غلاموں کی ذیل میں آجاتے ہیں) بھوکوں کو کھانا کھلایا جاوے۔ ایسا ہی رشتہ کے یتیموں کو اور ایسے غربا کو بھی جو مٹی میں مل گئے ہوں یہی اچھے راہ پر چلنے والے لوگ ہیں۔ اور وہ شخص بھی (ہدایت یافتہ ہے)، جو (خود) مومن ہو۔ (ان باتوں پر عمل کرتا ہو) اور دوسروں کو بھی صبر و شفقت کا سبق دیتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کو ہی معبود سمجھو۔ اور کسی کو اُس کے

ساتھ شریک نہ کرو (اور یاد رکھو کہ خدا کے بغیر دوسرا درجہ والدین کا ہے (ہاں جو باتیں والدین خدا کے کسی حکم کے خلاف کہیں وہ تو نہ کرو۔ لیکن) اُن سے نہایت نرمی سے سلوک کرو۔ والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اور اُن کے بعد رشتہ داروں سے۔ یتیموں سے اور مسکینوں سے اور ہمسایوں سے۔ ہمسایوں میں نہ صرف وہی ہمسائے شامل ہیں جو تمہارے رشتہ میں ہوں۔ بلکہ ایسے ہمسایہ بھی جو اجنبی اور غیر ہوں (خواہ وہ کسی قوم و ملت کے ہوں) ایسا ہی جو تمہارا رفیق سفر ہو۔ یا کوئی راہ چلتا ہو۔ اس کے ساتھ بھی احسان کرنا چاہئے خدا کا یہی حکم ہے۔ کہ اُسی کے حکموں کو مانو۔ اور والدین سے محبت کیا کرو (خصوصاً) جب اُن میں سے کوئی ضعیفی کی عمر تک پہنچ جاوے۔ ان سے سختی سے پیش آنا تو درکنار اُن کے آگے اُف تک نہ کیا کرو۔ جب اُن سے بولو۔ نرمی سے بولو۔ رشتہ داروں سے مسکینوں سے راہ چلتوں سے نیکی کرو لیکن فضول خرچ مت ہو۔ فضول خرچ شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ (بالمقابل) خیرات کرنے میں ہاتھ بالکل ہی نہ روک لو۔ اور نہ بالکل ہاتھ ایسا کھلا کر لو۔ کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے (اور اُلٹے) لوگ تم پر ملامت کریں (یہ خیال نہ کرنا) کہ خیرات سے کوئی غریب ہو جاتا ہے۔ اللہ جس پر چاہے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ہم نے (خدا) انسان کو والدین کے متعلق بہت تاکید کی ہے (اول تو) اس کی ماں ضعف اور کمزوری کے ساتھ اُسے رحم میں) اُٹھائے پھرتی ہے

پھر دو سال اس کی رضاعت میں ختم ہو جاتے ہیں۔ تم ہمارے (خُدا کے) شکرگذار بنو اور اپنے والدین کے شکرگذار بنو۔ آخر کار تم نے ہماری طرف ہی آنا ہے (اگر دولت مند اپنی دولت کا مصرف نہیں جانتے) تو انہیں کہہ دو۔ کہ تم اپنی دولت اپنے والدین اپنے اعزا، یتیم، محتاج، مسافروں پر خرچ کیا کرو (اور یہ تمہاری خیرات ضائع نہیں جاتی) جو نیکی بھی کرو گے۔ خدا اُسے یقینی جانتا ہے۔ جب کسی انسان کو خدا تعالےٰ ابتلا میں ڈالتا ہے۔ اور اس پر تنگ دستی وارد ہو جاتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرے خدا نے مجھے ذلیل کر دیا (نہیں ہم نے نہیں ذلیل کیا اسکی وجہ تو یہی) کہ تم یتیموں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اور غربا کی پرورش کے لئے ایک دوسرے کو ہدایت نہیں کرتے تھے۔ (اپنے ہی حال میں مست ہو۔ اس کا ہی یہ نتیجہ ہے) (مجرم جہنم میں آئینگے اور پوچھے جائینگے کہ تمہیں جہنم میں کون لایا۔ وہ کہیں گے۔ کہ ہم نہ خدا کو یاد کرتے تھے نہ غربا کی پرورش کرتے تھے۔ (نیک لوگ دکھاوے سے یا ریاکاری سے یا دُنیا کو خوش کرنے کے لئے خیرات نہیں کیا کرتے وہ تو) محض محبت خدا میں غربا کو۔ یتامیٰ کو اور قیدیوں کو (جو کسی قسم کی قید میں ہوں) ان سب کو کھانا دیتے ہیں (اور اپنے احسان یافتہ کو کہتے ہیں کہ ہم تو محض خدا کے لئے تمہیں کھانا دیتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی عوض نہیں رکھتے۔ نہ کوئی بدلہ تم سے چاہتے ہیں (نیکی اور احسان کا یہ رنگ وہ ہے کہ جس سے انسان میں ادراک ذاتی

اور اوراک منزلی و اصدقائی کے بعد دوسرے اوراک آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ
یہ اوراکات اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسان اپنے احسان یا فنتوں کی طرف کسی
عوضہ یا شکر گذاری کے لئے نہیں دیکھتا۔ ان اوراکات کی استعداد میں اور بھی قوتِ
نشوونما پیدا ہو جاتی ہے۔ جب خیرات انسان پبلک کے علم کے بغیر کرتا ہے۔ کیونکہ
جب ریاکاری یا خیال عوضہ و تشکر خیرات کے وقت اُس کے سر سے نکل جاتا ہے۔ تو
پھر اُس کی خیرات ہر طبقہ تک پہنچ جاتی ہے۔ البتہ خیرات کو دکھا کر کرنا بھی خالی از فائدہ
نہیں ہوتا۔ اس سے دوسروں کو بھی تحریک ہو جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ) اگر تم خیرات
کھلے طور سے دو۔ وہ بھی بہتر ہے۔ لیکن اگر چھپا کر دو۔ اور غربا کو دو تو یہ بہت بہتر ہے
اس سے تمہاری غلط کاریاں تم سے دور ہو جاتی ہیں۔ اور خدا تو سب کو جانتا ہے۔
دراصل ریا سے ہی انسان میں تفاخر اور اس کے بعد غرور اور پھر تکبر کا مادہ پیدا ہو
جاتا ہے۔ اور یہ کل گناہوں کی جڑ ہے۔ اس کا علاج یہی ہے۔ کہ خیرات پوشیدہ کیجائے
غیر مسلموں سے (جن سے جنگ ہو اُن کے سوا سب سے) نیکی اور مروت سے ہی سلوک
کرنا (چنانچہ فرمایا کہ) خدا تعالےٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور نصفت شعاری
سے نہیں روکتا۔ جو نہ تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اور نہ جنہوں نے تمہیں گھر سے نکالا۔
اللہ تعالےٰ نصفت شعاری کو پسند کرتا ہے۔ اگر کوئی بُت پرست یا مشرک بھی تمہاری

پناہ میں آجاوے۔ اُسے ضرور پناہ دو۔ خدا کی باتیں بھی سناؤ۔ اور اُسے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ لوگ صاحب علم نہیں۔ نیکی اور راستبازی اس چیز کا نام نہیں۔ کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو۔ نیکی اسی میں ہے۔ کہ خدا۔ یوم آخر۔ ملائکہ۔ خدا کی کتب۔ اور اس کے نبیوں پر ایمان لاؤ۔ اور محض خدا کی محبت میں اپنے مالوں کو اقربا پر۔ یتامیٰ پر۔ مسکینوں پر۔ راہ گیروں پر۔ سائلوں پر اور جو کسی قسم کی مصیبت میں ہوں اُنکے چھڑوانے پر خرچ کرو۔ نمازیں پڑھو اور خدا کو یاد کرو۔ زکوٰۃ دو۔ وعدے پورے کرو مصیبت اور تکلیف کیوقت صبر دکھلاؤ۔ دنیا کے بعض مذاہب رسمیات بعض معتقدات اور بعض عملیات پر زور دیتے ہیں یہ تینوں باتیں اپنی اپنی جگہ فائدہ سے خالی نہیں۔ قرآن نے یہاں ان تینوں امور کو بطریق مناسب جمع کر دیا۔ اس آیت نے تو حقیقت مذہب کو کس خوبصورتی سے واضح کر دیا۔ مذہب کسی رسم ورواج کا نام نہیں۔ مذہب تو ہمدردی انسانی کا نام ہے۔ اور ان باتوں کے کرنے کا نام ہے۔ کہ جس سے انسان کا جان و مال حفاظت میں آ کر انسان کو کامل متمدن اور با اخلاق بنا دے۔ چونکہ معتقدات ہی ہمارے اعمال کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس آیت میں ضروری اعتقادات کا بھی ذکر کر دیا گیا +

ان آیات پر عمل کرنا گویا **ادراکات** مذکورہ بالا کی بہترین آبیاری کرنا ہے۔

مخلوق الٰہی کا کوئی طبقہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا۔ جسے انسانی شفقت کا مورد بنانے

کے لئے ان آیات میں ہدایات نہ ہوں +

فضلائے مسیحیت نے مذہب محبت کی فہرست میں جہاں بدھ مذہب کو داخل کیا وہاں اس فہرست میں اسلام کو داخل کرنے سے تامل کیا۔ حالانکہ اسلام ہی مذہب محبت مکمل طور پر دنیا میں لایا۔ ان لوگوں کے دلوں میں شائد اُن جنگوں کا خیال ہوگا۔ جن کی اجازت اسلام دیتا ہے۔ لیکن موجودہ جنگ نے تو اُس ہذیان کا اب منہ بند کردیا جو اسلام کے خلاف عیسائی مشنری پراپوغنڈا اس امر میں کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ جب ازراہِ تعصب حق جوئی اور حق بینی سے بہت دور چلے گئے۔ تو خدا تعالیٰ نے یہ جنگ عظیم پیدا کرکے ان پادریوں کے ہاتھ سے سب ان کے مفروضہ معتقدات خاک میں ملا دئے۔ جون ۱۹۱۷ء کو لندن کا منظر میری نگاہوں نے نہایت دلچسپی سے دیکھا۔ جب لندن کا بشپ پادریوں کی ایک جماعت کو گلے میں صلیب لٹکائے ہوئے لندن کے بازاروں سے پھرتا ہوا ہائیڈ پارک میں لے گیا۔ وہاں اُس نے تقریر بھی کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اس جنگ میں شریک ہونا اور اپنے ملک کو حملہ سے بچانا ہی مذہب ہے۔ پھر اُس نے نہایت ہی کمزور طریق پر مسیح کے **خطبہ کوہی** کی اُن آیات کی کچھ توضیح بھی کی۔ جو شمولیت جنگ سے روکتی تھی۔ الغرض اس جنگ نے جس میں بہت سے پادری بطور سپاہی شریک ہوئے اور لڑے

ثابت کر دکھایا۔ کہ بعض جنگ نسل انسانی کے امن کے لئے ضروری ہیں۔ اور سچی
محبت انسانی اسی میں ہے۔ کہ ظالموں کے ہاتھ سے بذریعہ جنگ خلق خدا کو بچایا جائے
امن عامہ کے لئے جنگ ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسے اور امن و آشتی کے رستے
اسلامی جنگوں کے متعلق میں یہاں کوئی لمبی چوڑی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ نہایت
مختصر الفاظ میں قرآن کریم کی تعلیم اس امر کے متعلق یہاں دے دیتا ہوں۔ جو غلط فہمیوں
کے دور کرنے کے لئے کافی ہے +

قرآن کریم نے صرف تین ہی موقعوں کے لئے جنگ کی اجازت دی ہے۔ دو
امور تو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرے کا تعلق حفاظت خود اختیاری سے ہے
مذہب کی خاطر جنگ کرنا نہ تو اشاعت مذہب کے لئے ہی جائز ہے۔ نہ کسی کو زبردستی
مذہب میں داخل کرنے کے لئے۔ بلکہ حفاظت مذہب کے لئے **اولاً** جب کسی مذہب
کی عبادتگاہ خطرے میں ہو۔ اور اس مذہب کے مخالف یا کوئی اور اُسے مسمار کرنا
چاہیں تو ایک مسلمان کا فرض ہے۔ کہ وہ اُس عبادتگاہ کے بچانے کے لئے خواہ وہ
عبادتگاہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو۔ جنگ کرے +

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ
يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ (الحج ۴۰)

ترجمہ۔ اگر خدا تعالےٰ نے بعض لوگوں (کی شرارت) کا دفعیہ دوسروں کے ذریعے نہ کرتا تو خانقاہیں۔ گرجے۔ یہودیوں کی عبادتگاہیں۔ اور مسجدیں گرائی جاتیں۔ جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے۔

کس فراخ دلی سے ہر مذہب کی عبادت گاہ کی حفاظت قرآن نے مسلمانوں کے ذمہ ڈال دی ہے۔ رواداری کی بھی کوئی حد ہے۔ کہ ان سب عبادتگاہوں میں مسجد کا نام سب سے اخیر لیا۔ اور سب سے پہلے دنیا جہان کی ایسی جگہوں کا نام لیا ہے۔ جہاں اُن مذاہب کے معلم رہیں۔ اور اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کریں۔ آج کوئی ہندوستان کا نقشہ ہی دیکھ لے۔ یہاں ایک ہزار برس تک تو مسلمانوں کی مضبوط سلطنت رہی۔ اور کل کا کل ملک قدیمی مندروں۔ شیوالوں اور ٹھاکردواروں سے آج بھی معمور نظر آئے۔ ان عبادت گاہوں میں بُت ہی ہزاروں برس سے پوجے جاتے تھے۔ یہ عمارتیں بھی قدیمی ہیں۔ مسلمان بت شکن بھی مشہور ہیں لیکن اس قرآن کی آیت کو وہ کیا کرتے۔ وہ تو ان عبادتگاہوں کو مسمار ہونے سے بچانے کی ہدایت دیتی ہیں اس لئے یہ سب مندر محفوظ رہے۔ بالمقابل سپین۔ مالٹا اور جنوبی فرانس کو دیکھ لو۔ مسلمانوں کی مساجد۔ زیارتگاہیں مقابر۔ کتب خانے اور مذہبی مدرسے کیا ہوئے؟ مسیحی ظلم و تعدی نے انہیں خاک میں

بلادیا۔ اب بتلاؤ کہ مذہب محبت عملاً کون ثابت ہوا۔ اسلام یا عیسائیت؟

دوسرا موقعہ جس پر ایک مسلمان نے تلوار اُٹھائی ہے۔ وہ اس لئے کہ ہر ایک انسان کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ انسان اور خدا میں معاملہ مذہب قائم رہے کوئی تیسرا شخص مذہبی امور میں انسان اور اُس کے خدا کے درمیان حائل نہ ہو۔ جس کا جو جی چاہے۔ مذہبی عقائد رکھے لیکن جب اس قسم کے مذہبی متعصب دُنیا میں پیدا ہو جائیں۔ جو اپنے ظلم اور تعدی سے نہ ہندو کو ہندو رہنے دیں۔ اور نہ عیسائی کو عیسائی۔ اور نہ مسلمان کو مسلمان۔ تو اُس وقت مسلمان کا فرض ہے۔ کہ ایسے ظالموں کے خلاف جنگ کرے۔ اور زمین پر وہ حالت امن پیدا کردے کہ ہر ایک انسان مذہبی معاملات میں اپنی رائے کا مالک ہو۔ اول تو قرآن نے یہ ہدایت کی۔ کہ لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ یعنی مذہبی معاملات میں کوئی جبر و اکراہ نہ کرو۔ جو کسی کی خوشی ہو۔ وہ مذہب رکھے۔ دین تو کسی نے خدا کا قبول کرنا ہے۔ اور اس میں اُسے آزادی کامل چاہیئے لیکن جب کوئی شخص اپنا مذہب دوسرے سے بہ سختی قبول کراتا ہے۔ خواہ وہ مذہب حقہ ہی کیوں نہ ہو۔ تو وہ خدا کا مذہب نہیں۔ بلکہ اپنا مذہب منواتا ہے۔ ایسے شخص کے ہر فتنہ کو روکنے کے لئے فرمایا۔ وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ط فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْ وَانَ

إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ترجمہ۔ ایسے لوگوں سے لڑو۔ جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور دین خدا کے لئے رہ جائے۔ لیکن اگر وہ باز آجائیں۔ تو پھر اُن سے جنگ نہ چاہیئے۔ الا اگر وہ ظلم پر اڑے رہیں ۔ (البقرہ۔ ۱۹۳)

تیسرا موقعہ جنگ کا حفاظت خود اختیاری ہے۔ اس میں ذیل کے احکام ہیں

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (البقرہ ۱۹۰-۱۹۲)

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج ۳۹-۴۰)

ترجمہ۔ خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو۔ جو تم سے لڑے۔ لیکن حدود سے نہ بڑھو۔ اللہ تعالیٰ حدود سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر وہ جنگ چھوڑ دیں تم بھی جنگ چھوڑ دو سب سے پہلی آیت جس نے جنگ کی اجازت دی۔ وہ یہ ہے، ان کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ

کی گئی۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو گھروں سے نکالا گیا۔ اس کی کوئی وجہ حقہ نہ تھی۔ ان کا قصور تھا کہ وہ اللہ کو پروردگار سمجھتے تھے۔

ان آیات کی عملی تفسیر حضرت نبی کریم صلعم کے غزوات سے ہوتی ہے۔ مجھے نہ ان جنگوں کی یہاں تشریح کی ضرورت ہے۔ نہ اُن اسباب کے بتلانے کی حاجت ہے جن سے یہ جنگ پیدا ہوئے۔ دو لفظ میں یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ کہ آیا یہ جنگ اس حکم بالا کے ماتحت تھے۔ یا مذہب کے پھیلانے کی غرض سے؟ ان غزوات میں سے نمایاں صرف تین جنگ ہیں جن کے بعد عرب میں صورت حرب پیدا ہو گئی۔ باقی کل کے کل جنگ اسی قسم کے تھے۔ جو صورت حرب سے تعلق رکھا کرتے ہیں۔ پہلے تین جنگ **بدر**۔ **اُحد**۔ اور **جنگ احزاب** کے نام سے مشہور ہیں۔ ان تینوں جنگوں کے مقام کی تعیین کر لو۔ اور خود فیصلہ کر لو۔ کہ آنحضرت صلعم اپنی جان بچانے کے لئے گھر سے نکلے۔ یا کسی اور غرض سے؟ آنحضرت صلعم نے حفاظت جان کے لئے ایسے وقت میں جب کفار کیطرف سے اذیت کی کوئی حد نہ رہی۔ مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی آپ تو مدینہ چلے آئے۔ لیکن دشمن آپ کو اور آپ کے مشن کو خاک میں ملانے کے سوا کب باز رہ سکتا تھا۔ دشمن مکہ میں ہے۔ اور آپ مدینہ میں۔ مکہ مدینہ میں ایک سو پچاس ۱۵۰

میل کا فاصلہ ہے پہلے جنگ کا مقام بدر ہے۔ جو مکہ معظمہ سے ایک سو بیس میل [۱۲۰]
اور مدینہ سے تیس میل پر ہے۔ دوسرے جنگ کا مقام اُحد ہے۔ جو مکہ مکرمہ سے ایک
سو اڑتیس میل [۱۳۸] اور مدینہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ تیسرے جنگ احزاب
میں عرب کی کل قومیں مدینہ پر چڑھ آئیں۔ اور آنحضرت صلعم محصور ہو گئے۔ یہ تین
جنگ ہیں۔ اب خود فیصلہ کر لو۔ کہ لڑنے کو کون آیا۔ اور جان بچانے کے لئے گھر سے
کون نکلا؟ اس جنگ کے بعد ایک حربی کیفیت ملک میں پیدا ہو گئی۔ اور کبھی اس
طرف سے اور کبھی اُس طرف سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں کا خاتمہ
فتح مکہ نے کیا۔ آنحضرت صلعم گھر سے حج کے لئے دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ نکلے
اور مکہ سے باہر ڈیرے ڈال دئے۔ دنیا کی تاریخ میں فتح مکہ ہی ایک ایسا واقعہ
ہے۔ کہ جس میں ایک قطرہ خون بھی نہ گرایا گیا۔ دشمن مغلوب ہو گئے۔ یہ دشمن وہی تھے
جنہوں نے آنحضرت صلعم اور اُن کے رفقا کو ہر طرح کی تکلیف دی۔ اور اسلام کے
مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ لیکن جب وہ سامنے آئے۔ تو سب کو معاف کر دیا۔
مسیحؑ نے یہ تو کہہ دیا۔ کہ "اپنے دشمنوں سے محبت کرو" لیکن تاریخ عالم میں اگر اپنے دشمن
سے کسی نے محبت کی۔ تو اس کا **عملی نمونہ فتح مکہ** میں ہی پاؤ گے۔ کسی کا صلیب
پر کھڑے ہو کر اپنے ظالموں کو معاف کر دینا کوئی عمدہ مثال دشمنوں سے محبت کی نہیں۔

دشمن اور ظالم کو معاف کرنا اُس وقت ہو سکتا ہے۔ جب یہ تین صورتیں پیدا ہوں۔
اوّل۔ ایک شخص پر ظلم ہو۔ دوئم مظلوم دشمن پر غالب آئے۔ اور انتقام لینے
کی قدرت رکھتا ہو۔ سوئم۔ انتقام کی بجائے معاف کر دے۔ جب تک یہ باتیں موجود
نہ ہوں۔ مظلوم اور مقہور حالت میں کسی کو معاف کر دینا محض دل کو خوش کرنا ہے۔
البتہ نیک دلی کا اظہار ضرور ہے۔ بات تو تب ہے کہ ع

"گر بہ طاقت برسی ہست نگر دی مردی"

یہی وہ مذہب **محبّت** ہے۔ جو اسلام لایا۔ مذہب محبت چند نرم اور آشتی کے
فقروں سے نہیں بنا کرتا۔ مذہب محبت میں مخلوق الٰہی کے نفع کو سامنے رکھنا ہے۔
اور اس نفع کی حفاظت میں اگر ایسے لوگوں کی تادیب۔ اصلاح اور اُن کے ضرر
کو روکنے کے لئے کچھ سختی بھی برتنی پڑے۔ جو مخلوق الٰہی کے مفاد کے دشمن ہوں
تو وہ سختی نہیں۔ وہ بھی محبت ہے۔

قرآن کریم نے اُن مواقع کا بھی لحاظ کر لیا ہے۔ جو انسانی شفقت و رحمت کو کسی
دوسرے کی طرف نہیں جانے دیتے۔ آج مشرق مغرب کے جھگڑے نے کس قدر
مصیبت ڈال رکھی ہے۔ بعض مشرقی قومیں بالخصوص مغربی نگاہ میں حیوانوں سے
بھی بدتر ہیں۔ ادنیٰ قوموں کو تو چھوڑ دو۔ کل کی کل مشرقی قومیں اہل مغرب کی نگاہ میں

درجۂ انسانیت میں بھی اُن کے ہمسر نہیں۔ ایک کُتا جن مراعات کا مغرب میں مستحق سمجھا گیا ہے۔ اُس کے عشر عشیر سے بھی بعض انسان محروم رکھے جاتے ہیں۔ جاپان کی موجودہ تباہی پر ریورنڈ بی۔ ٹی ولڈن ہارسٹ گرجے میں دُعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ کہ زلازل جاپان ایسے وقت واقع ہوئے۔ جب اکثر یورپین لوگ وہاں سے نکل چکے تھے۔ جس مذہب نے اس احساس وادراک کے معلمانِ مذہب پیدا کئے ہیں۔ اس کو مذہب محبت کہنا عجب بوالعجبی ہے۔ اسی مشرق ومغرب کے سوال کو سامنے رکھ کر قرآن مجید نے جس خدا کی عبادت کرائی۔ اس کا نام نہ صرف رب العالمین ہی فرمایا۔ بلکہ اس کو رب المشرق والمغرب بھی کہا۔ اسلام میں عبادت کی بہترین شکل مخلوق کی ہمدروی ہے ؀

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ ۝ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۔ ترجمہ۔ کیا تو نے اُس شخص کی حالت پر غور کیا۔ جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس نمازیوں پر افسوس ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ جو دکھاوا کرتے ہیں اور

خیرات کو روکتے ہیں + (الماعون)

اس سورت میں گویا دین کے معانی ہی یتیموں سے نیک سلوک اور غرباء کی پرورش ہے۔ ایسا ہی اس شخص کی عبادت کی بھی کوئی عزت خدا کی نگاہ میں ظاہر نہیں کی گئی جو خیرات وحسنات نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا ہے۔ تو دکھانے کے لئے کرتا ہے۔ الغرض رب قرآن کریم کا وہ پرستار ہی نہیں۔ جو اپنی ہمدردی میں مشرق ومغرب کا لحاظ کرتا ہے +

دُنیا میں مختلف مذاہب کا تعلق بھی اہل مذہب کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے سے روک دیتا ہے۔ بعض لوگ دوسرے مذہب والے پر ضلالت و گمراہی کا ہی فتوٰے نہیں دیتے۔ بلکہ بعض وقت اس کو اپنی ہمدردی کا بھی مستحق نہیں سمجھتے۔ کسی شخص کا دوسرے مذہب سے تعلق رکھنا اُن کی مراعات سے اس کو خارج کردیتا ہے۔ اس نقص کو سامنے رکھ کر قرآن نے ہر مذہب کو دراصل سرچشمہ الٰہی سے نکلا ہوا ہی قرار دیا۔ اور اُنکے رہنماؤں کو خدا کے نبی اور مرسل قرار دیا ہے۔ اور ان کی تعلیمات کو اپنے اصلی رنگ میں واجب الاتباع ٹھہرایا۔ کاش دنیا اس اصول اسلام پر عمل کرتی۔ تو اہل مذاہب کا باہمی فساد نصف سے زیادہ ختم ہوجاتا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ میں کسی مذہب کے بزرگ کی دل سے عزت کروں۔ اور میرا یہ عمل اس کے پیرو کے دل میں میرے لئے عزت اور محبت پیدا نہ کردے۔ مذہبی اور قومی تخالف علی العموم انسان کو

عدل کی راہوں سے بہت دُور پھینک دیتا ہے لیکن قرآن کریم نے اس بات کا بھی ازالہ کر
دیا ہے ۔ جیسے کہ فرمایا ۔ لا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ ۔
یعنی قومی تخالف تمہیں ایسا نہ کر دے کہ تم عدل کو چھوڑ دو ۔ تمہیں عدل ہی کرنا ہے یہ پرہیزگاری
کے بہت ہی قریب ہے ۔ اگر دنیا اس ایک حکم کی پابندی کر لے تو مذہب محبت کی وہ پختہ
بنیاد قائم ہو سکتی ہے جس سے آئندہ کی تعمیر آسان سے آسان ہو جاتی ہے ۔ میں اوپر دکھا
چکا ہوں کہ ارتقائے ادراک میں پہلی منزل **ادراک ذاتی** ہے یعنی انسان اپنے حقوق
اوروں سے پہلے اور دوسروں کے حقوق اُنکو دیدے ۔ گویا ادراک ذاتی کی تکمیل کے لئے
عدل ازبس ضروری ہے ۔ کل دنیا پر نظر ڈال کر دیکھو کتنے ہیں جن میں یہ ادراک ذاتی
کامل طور سے نشو و نما پا چکا ہے ۔ ہزاروں چھوڑ لاکھوں میں ایک انسان بھی اس خوبی کا
نظر نہیں آتا ۔ یہ اہل مغرب جو عیسویت کی روایات اور کلیسیا کے معتقدات سے بیزار ہو کر
مذہب محبت کی تلاش میں لگ گئے ہیں ۔ وہ سب سے پہلے اپنے بھائی بندوں کو **خلق**
عدل کی تعلیم دیں ۔ کیا رنگ ۔ مذہب اور قوم کی تمیز اہل مغرب کو دیوانہ نہیں بنائے
رکھتی ۔ عدل کی طرف تو تب متوجہ ہوں جب کسی اور کو اپنے برابر سمجھیں ۔ دوسرے تو
اُن کی نگاہ میں انسان ہی نہیں ۔ پھر عدل کیسا ۔ یہ مذہب محبت کے متلاشی بزرگ
اپنے مصالح کے مقید ہو کر علی الاعلان اسلام قبول کریں یا نہ کریں ۔ لیکن مذہب محبت
کے اصول حقہ کی اگر ان کو ضرورت ہو تو انہیں قرآن حمید کے ہی آگے سر جھکانا پڑیگا ۔

وما علینا الا البلاغ ۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

من کلام البرق گنجوی سلمہ القوی

زد ینابیع المسیحیت رقم	حضرتِ خواجہ کمال الدین چنان
شک نہ باقی ماند در کسرِ صلیب	ریزہ ریزہ شد چلیپا در جہان
چون نقاب افراخت از حُسن فرنگ	بُد نگارِ پیرۂ شمتاسیان
آنکہ گویندش کنیسا۔ دیر بُود	نیرِ مشرق بمغرب بُد نہان
فتنہ زد پولوس در دینِ مسیح	کردہ در ظلمت نہان نورِ جہان
در لباسِ ابنِ مریم جلوہ داد	ذاتِ متھرا کو بُد از ایرانیان
جانشینِ آئی سِس مریم نمود	اوسرس شد ابنِ مریم۔ الامان
بعل و متھرا ہورس و بکیس اطیس	جملگی در ذاتِ جیسس شد عیان
دمیتر۔ نانا۔ وینتھ و چملن	کردہ در مریم ہمہ پیدا نہان
شد ز کلکِ شعلہ پاشِ خواجہ ام	آشکارا این قضائے آسمان
مثلِ جاپان گشت برباد و فنا	آخرش مستعمراتِ راہبان
اے مثیلِ ابنِ مریم ذکرِ تو	کرد شاگردِ تو روشن در جہان
اے امام الاتقیا! بر نقشِ تو	زد قدم تلمیذت۔ اے رحمت بر آن
سالِ طبع این سراجِ راہِ حق	برق می پرسید از دل۔ ناگہان
آمد از چرخِ چہارم این ندا	آہ برج و قلعۂ تثلیثیان

۱۹ — ۶ — ۲۳